ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

جنوری ۲۰۱۵ء

ہمیں اسی ملک میں اپنے تشخص کے ساتھ رہنا ہے

ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا..... ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی، مجبوری یا بے چارگی پر مبنی نہیں، ہمارے آس پاس اور دور و نزدیک بہت سے اسلامی ملک ہیں، جہاں ہم منتقل ہو سکتے ہیں، لیکن ہم نے سوچ سمجھ کر یہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر اور اپنی پوری مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے۔

(مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)

ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

Rs. 20:00

فہرست مضامین

۱۔	لمحۂ فکریہ	ندوے کو آگ لگا دو اور علی کو بھی پھونک دو	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
۲۔	اداریہ	موجودہ صورت حال اور چند تجاویز	مدیر ۳
۳۔	گوشۂ سیرت	تم سا ہم کسے پائیں گے؟ (قسط-۱۲)	تحریر: مسٹر اڈیار، مترجم: ایم، اے، جمیل احمد ۶
۴۔	نقطۂ نظر	ندوۃ العلماء کا فکری وملی شعور مولانا علی میاں.....	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۸
۵۔	اصلاح معاشرہ	عید میلاد النبیؐ منانا آخر کیوں منع ہے؟	ندیم احمد انصاری ۴۲
۶۔	یاد رفتگاں	آہ! حضرت مولانا قاری محمد قاسم صاحبؒ	جمال احمد ندوی ۴۶
۷۔	سبق آموز	کسی کو برا کہنے کا انجام پہلے برسوں میں.....	محمد الیاس ندوی بھٹکلی ۵۰
۸۔	احتساب	اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے ہیں!	محمد قمر الزماں ندوی ۵۵
۹۔	تبصرہ	ماہنامہ الفرقان-خصوصی اشاعت	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی ۵۷
۱۰۔	**اعلان**	**مقابلہ بین المدارس واسکولز**	ادارہ ۵۸
۱۱۔	آخری صفحہ	میری یہ آواز ہر دینی ادارے تک پہنچا دی جائے!	م، ق، ن ۶۴
۱۲۔	شعر وادب	غزل	کلیم عاجز

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہو سکتی ہے۔

اداریہ

موجودہ صورت حال اور چند تجاویز

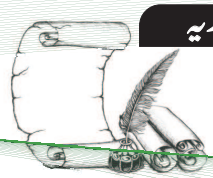

ہندوستان میں تقریباً ۲۵ رکروڑ مسلمان ہیں، ان کے خمیر میں ہندوستان کی مٹی شامل ہے، ان کے آباء واجداد کے احسانات اس ملک کے چپہ چپہ پر ہیں اور اس کا گواہ اس سرزمین کا گوشہ گوشہ ہے، مسلمانوں کا اس ملک میں وجود یوں ہی نہیں ہے بلکہ بقول مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ..... مسلمانوں نے اس ملک میں پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور تشخص کے تحفظ کے ساتھ اس ملک میں رہیں گے۔

لیکن صورت حال بڑی نازک ہے، گزشتہ کچھ دنوں سے ملک کا منظر نامہ بدلا بدلا سا ہے، خبریں بڑی عجیب سی ہیں، کبھی ہندو راشٹر کا مطالبہ ہے، کبھی ہندو ریاست کا مطالبہ ہے، کہیں دھرم پریورتن کی خبریں ہیں اور کہیں گھر واپسی کی مہم چلائی جارہی ہے، غرض یہ کہ ہر طرف خوف و ہراس کا ماحول پیدا کیا جارہا ہے..... کہنے کو کچھ بھی کہا جائے لیکن سچ یہ ہے کہ ہماری کچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جو دانستہ ہوتی ہیں اور جنہیں جانتے ہوئے بھی ان کے تدارک کی کوشش نہیں ہوتی، مضامین ومقالات اور نظریات کی بھیڑ ہوتی ہے لیکن عملی میدان میں سوائے نام ونمود کے کچھ نہیں، RSS کا جو میدانی کام (Feeld work) ہے اس کی مثال ہمارے یہاں اگر ہے تو وہ محدود پیمانے پر ہے اور نظریات کی قید نے اس کے فائدے کو مزید محدود کر دیا ہے۔

مختلف میدانوں میں کام کرنے کے لئے زمینی سطح پر متحرک ہونا وقت کی اہم ضرورت ہے، ہر کام ہر شخص نہیں کر سکتا لیکن ہر کام کرنے والے کا تعاون کرنا ہر شخص کا فرض ہے، مگر افسوس کہ تعاون علی البر کا جذبہ بالخصوص خواص اور دانشور طبقہ میں ناپید ہوتا جا رہا ہے، عوام کے متعلق کچھ نہیں کہنا کہ وہ بے چارے اپنے قائدین کے پیچھے چلنے پر بہر حال راضی ہوتے ہیں، یا مجبور ہو کر ان کے پیچھے چل دیتے ہیں، یقیناً بہت سے لوگ بہت سے کام کر رہے ہیں لیکن مزید کام کی منظم انداز اور باہمی تعاون کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں چند تجاویز ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔

۱۔ وسعت قلب ونظر کی عادت ڈالی جائے، ہر فکر و جماعت کے لائق تقلید اور مفید اصولوں اور کاموں سے نہ صرف فائدہ اٹھایا جائے بلکہ تعاون کیا جائے، ایک ہی شخصیت کو لازم پکڑنے اور اپنی تنظیم و جماعت کے خود ساختہ اصولوں کے پیش نظر اسلام کی وسیع اور مسلم جہتوں سے آنکھیں بند کر لینے سے جہاں فائدے ہین و ہیں بہت سے نقصانات ہیں، سب سے بڑا نقصان انتشار اور تعاون علی البر کے جذبہ کا فقدان ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ بہت سے لوگ بہت سے کام کر سکتے ہیں لیکن ان کی کسی جماعت یا کسی فکر سے وابستگی ان کے بیڑیاں ڈال دیتی ہے بلکہ بسا اوقات وہ بہت مفید کام کے مخالف ہو جاتے ہیں۔

۲۔ سیاسی صورت حال کی تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ امت کسی ایک قیادت کے سایہ میں اپنے تمام اختلافات کے باوجود متحد ہو اور صورت حال کا مقابلہ کرے، اس سلسلہ میں متعدد بار ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں، اور اس وقت

یہ کام انتہائی ضروری ہے بلکہ یوں سمجھا جائے اس کام کو کر ڈالنے کی یہ آخری مہلت ہے، اس کے بعد مہلت نہیں سزا کا دور شروع ہوگا۔

۳۔ ایسا نہیں کہ قوم اپنا سرمایہ تعلیم و دعوت پر خرچ نہیں کر رہی ہے، ضرورت ہے کہ اس کے استعمال کو مؤثر اور درست کیا جائے، ایک ہی ادارہ میں مختلف کورسز کے لئے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں، غریب اور متوسط مسلمانوں کی تعلیم کے نام پر قوم سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے، پھر اس قدر فیس کا مطالبہ ہوتا ہے کہ اس کے سبب صرف سرمایہ دار ہی ان قومی اداروں مین اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکتے ہیں، حالانکہ ان اداروں کی تعمیر میں جانے کتنے رکشہ والوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے خون پسینہ سے حاصل کی ہوئی گاڑھی کمائی لگی ہو، آپ خوب جانتے ہیں کہ ان اداروں میں کس کس طرح کا استحصال ہو رہا ہے۔

۴۔ مذکورہ بالا صورت حال سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے چھوٹے چھوٹے سستے لیکن معیاری ادارے قائم کریں، اور قومی خزانوں سے وجود میں آئے ان اداروں کا احتساب بھی کریں اور آئندہ کسی ادارے کے قیام میں اپنی سوجھ بوجھ کا استعمال کریں۔

۵۔ فکری ارتداد کو جنم دینے میں اسکولوں، کالجوں کا حصہ بہت بڑا ہے، اس میں ہمارے قومی سرمایہ سے وجود میں آنے والے ادارے بھی پیچھے نہیں، ہمارے بچے اس حال میں جوان ہوتے ہیں کہ ان کا جی مذہبی بات سے اکتاتا ہے، عقیدہ محض مادیت پر ہوتا ہے، جب مذہب کی پرواہ نہیں تو قومی وملی فکر کہاں؟ قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تو کچھ بھی نہیں، ضرورت ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں بنیادی دینی تعلیم اور فکری و مذہبی تربیت کو لازم کیا جائے اور بالخصوص قومی اداروں میں فحاشی کی تہذیب پر احتساب کیا جائے، انتہا یہ ہے کہ جن عصری قومی اداروں سے علماء کا تعلق ہے بسا اوقات ان میں بھی اسلامی تربیت کا انتظام کجا!! اس مغربی تہذیب کی عریانیت وفحاشیت سے بچانے کا کوئی نظم نہیں ہوتا جس کو لکھتے ہوئے قلم اور بولتے ہوئے زبان نہیں تھکتی۔

۶۔ مادیت سے دامن بچایا جائے، مادی تہذیب کو اپنا تشخص نہ بنایا جائے، مادیت کو معیار نہ سمجھا جائے، افسوس ہے کہ اب خالص دینی حلقوں میں بھی حسن وقبح کی تمیز کے لئے یہی مادیت معیار قرار پائی ہے، بقول مفکر اسلامؒ ہر اس چیز سے انکار و پرہیز کی ضرورت ہے جس سے مادیت کی تائید اور اس کے غالب ہونے کا خطرہ ہو، آج ضرورت کے نام پر مادیت نے ہر شخص کو جکڑ لیا ہے، اس کی سب سے بدترین شکل وہ ہے جو دین دار طبقہ میں نظر آتی ہے، اسی کے نتیجہ میں پس اندازی، سرمایہ داری اور پھر ادنیٰ مفادات کے عوض عزت وتشخص تک نیلام ہو جایا کرتا ہے۔

۷۔ مدراس کو معاشرے سے گہرا ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بالخصوص غیر مسلموں سے، بہت ساری غلط فہمیاں باہمی ربط (Interaction) کو فروغ دینے سے دور ہوسکتی ہیں، ہندو اور مسلمانوں میں خلیج خود بہت بڑا مسئلہ ہے، مدارس کو اپنے پروگرام میں یہ شامل کرنا چاہیے کہ مختلف عنوانات سے پڑھے لکھے اور دانشور طبقہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی بلائیں، مدارس کی پرسکون فضا سے نکل کر معاشرے کی تلخ فضا میں کچھ سانسیں لی جائیں، لوگوں سے مل کر ان کے حالات معلوم کیے جائیں، افسوس یہ ہے کہ غیر مسلم تو دور خود جس بستی اور محلّہ میں مدرسہ آباد ہوتا ہے اس کے ذمہ داروں اور اساتذہ سے وہاں کے لوگوں کا ملنا ہی مشکل ہوتا ہے، آخر برادران وطن میں دعوت کا فریضہ حضرات علماء انجام نہیں دیں گے تو

پھر کون؟؟ کیا بہت سے مسائل کی بنیاد اس پر نہیں کہ برادران وطن کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے میں ہم بڑی حد تک ناکام رہے ہیں۔

۸۔ غیر قومیں بالخصوص عیسائی مشنریز جس منظم طریقہ پر اپنا کام انجام دیتی ہیں افسوس کہ ہمارے یہاں اس کی بہت کمی ہے، ہماری بے شمار بستیاں ہیں جہاں بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوتیں، سردی ہے تو تن ڈھانکنا بھی نصیب نہیں، مرض ہے تو بنیادی دوا بھی نہیں نصیب، تعلیم کی کیا بات کریں، کہ ہمارے کسی ادارے کا مقصد ایسی بستیوں کے بچوں کو تعلیم دینا کہاں؟؟ ایسی ہی جگہوں پر غیر محنت کرتے ہیں اور ادنیٰ سی مراعات دے کر ایمان خرید لیتے ہیں، ان بستیوں میں تبلیغی جماعت کی محنت اپنی جگہ پر، لیکن ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے چھوٹے چھوٹے مکاتب کا قیام اشد ضروری ہے، اسی طرح ہر ایسے علاقہ سے قریب شہر وقصبات میں جو تنظیم بھی ہو اسے چاہیے کہ قومی سرمایہ کا صحیح استعمال کر کے ایسے لوگوں تک پہنچے اور جس حد تک ممکن ہو ان کی بنیادی ضرورت پوری کی جائے۔

۹۔ مثقف طبقہ میں فکری تربیت اور اسلام پر اعتماد بحال کرنے کی جہاں سخت ضرورت ہے وہیں غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں بنیادی دینی تعلیم کو عام کرنے اور انہیں دین کا پہلا سبق پڑھانے کی ضرورت ہے۔

یہ تمام کام کسی ایک شخص کے بس میں نہیں، مگر جو جس علاقہ میں ہو اسے چاہیے کہ اپنے علاقہ کی فکر کرے اور وہاں حسب استطاعت کام کی ذمہ داری لے، ان سب کاموں کو خوبصورتی سے انجام دینے کے لئے اجتماعی اخلاق اور بالخصوص دیندار طبقہ کی سیرت کے کمزور پہلوؤں کی اصلاح انتہائی ضروری ہے، اخلاص، باہمی اتحاد، باہمی ربط، للّٰہیت، وسعت فکر، وسعت قلب اور بے لوث جذبہ کے بغیر کوئی کام نتیجہ خیز اور ثمر آور نہیں ہوگا، ادارے نظر آتے ہیں، تنظیمیں موجود ہیں، اخبارات جلسہ وجلوس کی خبروں اور تجاویز سے بھرے رہتے ہیں لیکن تاثیر جس درجہ میں درکار ہے وہ ندارد!! ممکن ہے کہ آپ ایسا نہ سوچیں مگر جس حد تک مذکورہ بالا باتوں سے اتفاق کرتے ہیں اس حد تک کام شروع کر دیں یہی کامیابی کی شاہ کلید ہے، مسئلہ نہ منظر نامہ کو سمجھنے کا ہے اور نہ حکمت عملی تیار کرنے کا، منظر نامہ اپنی تمام تر خطرناکیوں کے ساتھ سب پر عیاں ہیں، حکمت عملی بھی سب کے پاس ہے، ضرورت ہے کہ اہل علم، اہل قلم اور اصحاب دین وارشاد میدان عمل میں آ کر حکمت عملی پر عمل دار آمد کی ابتدا کریں، جس کی سب سے پہلی منزل انا کی قربانی، سب سے پہلی شرط اخلاص اور سب سے پہلی کامیابی باہمی ربط وتعاون اور آپسی اتحاد ہے کہ ان کے بغیر کام سب ہوں گے مگر نتیجہ وہی ہوگا جو ہم دیکھ رہے ہیں، یہ بھی بہت بڑی ضرورت وذمہ داری ہے کہ کسی بھی میدان میں بالخصوص تعلیم اور دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کی کارگزاری اور ان کے متعلق مثبت خبروں پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھا جائے اور اسی پر بس اور اطمینان نہ کر لیا جائے بلکہ میدان میں جا کر بچشم خود مشاہدہ کیا جائے، کسی کام کے بہتر نتائج تبھی برآمد ہوں گے جب اسکو ماضی سے نہیں بلکہ حال سے مرتط کیا جائے، شنید پر نہیں دید پر اعتماد کیا جائے اور خبر کے بجائے مشاہدے کا اعتبار کیا جائے۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

☆☆☆

گوشۂ سیرت

(قسط-۱۲)

''اسلام- جس سے مجھے عشق ہے''

تم سا ہم کیسے پائیں گے؟

تحریر: مسٹر اڈیار •• ◆ •• ترجمہ: ایم اے جمیل احمد

مسلمان جاہل ہیں، ضدی اور غصہ ور ہیں، ظالم اور مغرور ہوتے ہیں۔ یہ باتیں عام طور پر غیر مسلم بھائیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

تحقیق کی جائے اور قریب جا کر دیکھا جائے تو ایک دوسری ہی حقیقت سورج سے زیادہ روشن سامنے آتی ہے۔

اسلام کے معنی ہی امن اور سلامتی کے ہیں۔ جہاں تک میرا علم ہے نرمی، جذبات پر قابو اور جذبۂ ضبط کا اگر کوئی بہترین نمونہ ہے تو وہ محمدؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

سبھی نیک لوگ اور مصلحین، اعلیٰ صفات سے متصف ہوتے ہیں، لیکن تاریخِ انسانی میں محمدؐ جیسی جامع شخصیت کہیں نہیں ملتی، اس بات کا اعلان میں اپنے قلب کی گہرائیوں سے کرتا ہوں۔

عرب کا حکمراں ہونے کے باجود آپؐ اپنے کام خود کر لیتے تھے۔ اپنے جوتے آپؐ خود گانٹھتے تھے۔ اپنے کپڑوں کا پیوند دستِ مبارک سے خود لگا دیتے تھے۔ مویشیوں کو اپنے ہاتھوں سے چارہ دیتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے دودھ دوہتے تھے۔

دودھ نوش کرنے والے اور دودھ ہی میں نہانے والے حکمرانوں تو دنیا جانتی ہے۔ لیکن دودھ دوہنے والے واحد حکمراں آپؐ ہیں۔

جنوبی ہند کا ایک واقعہ ہے۔ ایک رشی نے وائی گئی (Vaigai) ندی کے مٹی ڈھوئی۔ لیکن اس رشی نے مزدوری کے لیے مٹی ڈھوئی تھی۔ جب اس کا علم راجہ کو ہوا تو جس شخص نے رشی کے سر پر رکھوائی تھی اس کو راجہ نے سزا دی۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مدینہ کی مسجد کی تعمیر کے لیے کام کرنے والوں میں آپ بھی شریک رہے۔ یہ تاریخ کی انوکھی مثال ہے۔

آپؐ کا مکان بھی کچی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ کھجور کے پتے جس کی چھت تھے۔ آپؐ دنیا کو تج دینے والے راہب نہیں تھے بلکہ وقت کے ایک طاقتور حکمراں تھے پھر بھی آپؐ کی یہ سادگی اور یہ خاکساری!!! اس تصور ہی سے دل پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔

ہمیشہ ہنس مکھ چہرہ لیے ہوئے۔ نہ جھنجھلانے والے، نہ غصہ کرنے والے، نہ قہقہہ لگانے والے، ہر شخص کا ہاتھ بٹانے والے، باوقار چال چلن والے، کسی کے سلام کا انتظار کیے بغیر ہر شخص کو آگے بڑھکر سلام کرنے والے، بڑوں کو ان کے احترام ہی میں نہیں بلکہ چھوٹوں کو بھی شفقت سے سلام میں پہل کرنے والے۔ کوئی پکارنے والا خواہ وہ شخص گرایا ہوا، کچلا ہوا، پسا ہوا

اور دنیا والوں کی نگاہ میں حقیر ہی کیوں نہ ہو۔اس کی پکار پر گرم جوشی اور جذبۂ ترحم کے ساتھ لبیک کہہ کر اس کی مدد کو دوڑنے والے۔ یہ ہے عظیم و بلند کردار اس پاکیزہ نبیؐ کا۔

آپؐ نے زندگی بھر نہ کسی کو جھڑکا، نہ کسی پر لعنت کی، نہ کسی کو گالی دی۔

بہت سارے بزرگوں کا حال ہم جانتے ہیں کہ وہ باہر دوسروں پر تو نرم خو ہوں گے، صابر و ضابط نظر آئیں گے لیکن اپنے اہل و عیال میں اپنے نوکر چاکر اور اپنے ماتحتوں کے درمیان وہ سخت گیر، ڈانٹنے ڈپٹنے والے اور سخت کلام ہوتے ہیں۔

لیکن نبی کریمؐ کی تو شان ہی نرالی ہے۔ جیسے وہ دوسروں کے درمیان رہتے تھے ویسے ہی خوش خلق اور نرم خو اپنے اہل و عیال، نوکر چاکر اور ماتحتوں کے درمیان میں بھی تھے۔

آپؐ سے ملنے والے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے تو اس کا ہاتھ تھام کر آپؐ گفتگو فرماتے۔ آنے والا جب تک اپنا ہاتھ نہیں کھینچ لینا، آپؐ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے رکھتے۔ ساتھیوں کیھ ساتھ چلتے تو ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ملائے ہوئے چلتے، ہر کسی کو محبت اور احترام کے ساتھ پکارتے۔ کوآپؐ سے سخت لہجہ میں گفتگو کرتا تو آپؐ صبر سے برداشت کر جاتے۔ آپؐ کی حیا مثالی تھی۔ شریف خاندان کی باعفت دوشیزہ کی حیا سے بھی بڑھ کر۔

ایسے عظیم انسان کو جن خوش قسمت انسانوں نے اپنا رہبر بنایا ہے انہی کا نام مسلمان ہے۔ آپؐ کے پیروؤں میں آج بھی ان صفات کی چھاپ پائی جاتی ہے۔ یہ سب اس عظیم نبیؐ کا صدقہ ہے۔ (جاری)

☆☆☆

(بقیہ ص نمبر ۵۷ کا)

اس کے تمام مشمولات فکری بصیرت، ایمان وعقیدے کی پختگی، دینی غیرت، ملی حمیت اور تجربات ومطالعہ سے عبارت ہیں، اس قیمتی مجموعۂ مضامین کو عام کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر اردو پڑھنے والا ان مضامین کو پڑھ کر مستقبل کی حکمت عملی سے واقف ہو جائے اور ہندوستان میں اس امت کے مستقبل کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کر سکے، ہر حکمت عملی عمل درآمد کی محتاج ہوتی ہے، اس کے مخاطب ملت کے مثقف لوگ ہوا کرتے ہیں، ان ہی سے عمل کا مطالبہ ہوتا ہے لیکن پھر ان سے عمل کرانا بہت مشکل بھی ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان ہی کو اگر اخلاص کی دولت ہاتھ آجائے تو وہ جس طرف بھی رخ کرتے ہیں فتح و کامرانی ان کا مقدر بنتی ہے،

قارئین سے درخواست کروں گا کہ وہ ان مضامین کی اشاعت میں خوب دلچسپی لیں، یہ شمارہ خریدیں اور دوسروں کو دیں اگر یہ نہ ممکن ہو تو ایک دو مضامین کی فوٹو کاپی ہی اپنے حلقۂ احباب میں تقسیم کریں، اور محترم مدیر الفرقان سے التماس ہے کہ وہ ان قیمتی اور بصیرت افروز مضامین کی ہندی اور انگریزی اشاعت کی فکر فرمائیں، بہر حال اردو کا حلقہ محدود ہے یہ الگ بات کہ ان مضامین کے اصل مخاطب اردو داں ہی ہیں اور وہی اگر ہوش کے ناخن لے لیں تو زمانہ ان کے پیچھے چلنے کو بے تاب ہے مگر افسوس ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

☆☆☆

نقطۂ نظر

نوٹ: یہ مقالہ شبلی صدی بین الاقوامی سیمینار منعقدہ ۲۹-۳۰ر نومبر و یکم دسمبر ۲۰۱۴ء دار المصنفین اعظم گڑھ میں پیش کیا گیا، مقالہ کے مواد وموضوع کے پیش نظر افادہ عام کی غرض سے شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

تمہید:

۱۸۵۷ء کے بعد ملت اسلامیہ ہندیہ ہر اعتبار سے جس بحران سے دوچار ہوئی وہ کسی صاحب علم پر مخفی نہیں، علمی، فکری اور اقتصادی طور پر پوری ملت روبہ زوال تھی، ایک ہنگامۂ محشر بپا تھا، ہر ذی ہوش اور صاحب حس پریشان تھا، سب سے بڑا مسئلہ ملت سے احساس کمتری کو رفع کرنے کا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے جس کو جو صلاحیت دی تھی اس اعتبار سے وہ ملت کے لئے کام کررہا تھا، ان ہی حالات میں ۱۸۶۶ء میں دیوبند کی اصلاحی و تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کے پیش نظر اپنے باقی ماندہ اثاثے کی حفاظت تھی، اس کے بالغ نظر قائدین نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں میں دین کی محبت، شریعت کی حفاظت اور اس کے احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے نیز مغربی تہذیب کے مقابلہ میں استقامت وصلابت پیدا کی جائے، دوسری طرف سرسید احمد خاں مرحوم کا مکتب فکر تھا جنہوں نے بڑے غور وخوض کے بعد جدید تعلیم کی درسگاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۷۵ء میں ایم، اے، او، ہائی اسکول کی بنا ڈالی، اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی میں یہ دانشگاہ تبدیل ہوگئی، اس نے مغربی تہذیب وتمدن کو قبول کیا اور عصری تعلیم کے میدان میں یقیناً بڑی نمایاں خدمات انجام دیں، یہاں قابل ذکر یہ ہے کہ دیوبند قدیم صالح کی حفاظت اور اشاعت میں آخری درجہ پر قائم تھا اور علی گڑھ میں قوم سے احساس کہتری کو دور کرنے کا علاج صرف جدید نافع سے جلب منفعت کا تصور تھا، یہ اور بعض دیگر اسباب کی بنا پر ملت دو گروہوں میں تقسیم ہوکر رہ گئی تھی، شکست خوردگی کے احساس اور انگریزی تعصب کے ساتھ یہ ایک داخلی آزمائش اور اندرونی چیلنج تھا جس سے اس وقت کے دانشوران قوم نبرد آزما تھے، قصۂ قدیم و جدید کے سبب ملت کے دو طبقوں کے درمیان میں ایسی خلیج بڑھتی جارہی تھی جو تفرقہ وانتشار تک جا پہنچی تھی، فقہی مسالک

اور مذہب کے نام پر وجود میں آنے والے فرقوں نے الگ مناظروں کا بازار گرم کر رکھا تھا، تکفیری فتووں کی بہتات تھی اور اس طرح ملت متعدد دھڑوں میں تقسیم تھی، اس نازک صورت حال اور پرآشوب دور میں تحریک ندوۃ العلماء ۱۸۹۲ء میں وجود پذیر ہوئی، اس نے جہاں علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری کو اپنا نصب العین قرار دیا وہیں ایسے علماء پیدا کرنے کی بھی ٹھانی جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں، اس کے مقاصد میں اتحاد ملی کو فروغ دینا اور اخوت اسلامی کے جذبات پیدا کرنا بھی شامل رہا، اس نے اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور برادران وطن کو اس سے واقف کرانے کی ذمہ داری بھی قبول لی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا سے ہی اس تحریک کو قبولیت حاصل ہوئی، اور اس کے پہلے ہی اجلاس میں مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں نے شرکت کی اور ندوۃ العلماء کا عام استقبال ہوا، قدیم وجدید دونوں فکروں کے علمبرداروں نے اس تحریک کی آواز پر لبیک کہا اور اس کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہوئے مبارکبادی، اکابرین دیوبند اگر اس تحریک میں پیش پیش تھے تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگ بھی پیچھے نہیں تھے، ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس عام ۱۸۹۴ء کے بعد اسی سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجلاس میں اس تحریک کا باقاعدہ خیر مقدم کیا گیا، سید محمود اور نواب محسن الملک نے اس کی تائید و کامیابی پر مبارکباد کی تجویز پیش کی، بلکہ نواب صاحب نے تجویز پیش کرتے ہوئے بڑی مؤثر تقریر بھی کی اور اپنی تقریر میں ندوۃ العلماء کے اجلاس میں کی گئی تقریروں کا بار بار حوالہ بھی دیا اور اس تحریک کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی، اس تجویز (۱) کو سر سید احمد خاں نے ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کیا۔

اس تحریک کی کامیابی کا راز جہاں نفوس قدسیہ کا وجود ان کی تڑپ اور ان کی دوراندیشی ہے وہیں یہ بات بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ اس کو بہت سے سے ایسے مؤثر ترین افراد ملے جو گونا گوں صفات کے حامل تھے، جامعیت کی مثال تھے اور یہ تحریک ان کے دل کی آواز تھی، ان ہی میں ایک نام مولانا شبلی نعمانی کا ہے جو تحریک ندوۃ العلماء میں علی گڑھ کو چھوڑ کر شریک ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے اضطراب روح کا سامان تسکین اس تحریک اور بعد میں اس کے ماتحت دارالعلوم کو تصور کیا، علامہ شبلی ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس منعقدہ مدرسہ فیض عام ۱۵/شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲/اپریل ۱۸۹۴ء میں شریک ہوئے، اس اجلاس میں ہر مکتب فکر اور مسلک کے علماء کی نمائندگی تھی، مولانا شبلی نے ہی مولانا لطف اللہ صاحب کی صدارت کی تحریک پیش کی تھی، انہوں نے ہی ندوۃ العلماء کا دستور العمل پیش کیا تھا، طریقہ تعلیم کی اصلاح کی تجویز پر ان کی بڑی عالمانہ تقریر ہوئی تھی، ۱۹۰۵ء میں مولانا دارالعلوم کے معتمد مقرر ہوئے تھے، مولانا شبلی بلا کے ذہین اور بہت فائق عالم تھے، اس سے کس کو انکار ہے کہ شبلی کی زبان ہوشمند اور عالمانہ خطابت نے تحریک میں ایک روح پھونکی، ان کے دل دردمند نے ملت کے حال پر تڑپ کر اس تحریک کو قبول عام عطا کیا، اور پھر اس نے ملت کے مفاد میں مختلف کام انجام دیے، اس کے تو سب معترف ہیں کہ انہوں نے افراد کار کی ایک جماعت چھوڑی، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان

کے فکر ارجمند اور منفرد رنگ قرطاس کی کشش نے نہ جانے کتنوں کو اپنی زلفوں کا اسیر بنایا، ان کا طرز تحریر رائج ہوا، ان کے تصنیفی کام کی جدت اور نئے اسٹائل کی تقلید کی گئی، نثر ایسی کہ قلم کوثر و تسنیم سے دھلا ہوا تھا، نظم ایسی کہ گویا اس میں وہ اپنا دل نکال کر رکھ دیا کرتے تھے، انہوں نے نہ صرف اس تحریک سے وابستہ ہوکر اپنی ہوشمندی و دردمندی کا ثبوت دیا بلکہ ان کی شکل میں اس تحریک کو ایک مورخ، ایک مفکر، ایک سوانح نگار، ایک جہاں دیدہ اور ایک تجربہ کار و بیدار مغز عالم میسر آ گیا، جس نے آگے چل کر دارالعلوم کی معتمدی کے زمانے میں طلبہ کے لئے جس ذوق و مزاج کی تشکیل کی اس کی سب سے جامع تصویر مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت میں نظر آتی ہے، مولانا شبلی نعمانی ایک طرف تحریک کے مقاصد کے لئے سرگرداں رہتے تو دوسری طرف ان کا ذوق تصنیف انہیں سرگرم عمل رکھتا، دارالعلوم کے تعارف و تعاون کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، ملت کے کسی مسئلہ سے چشم پوشی اختیار نہ کرتے، عالم اسلام کے مسائل پر گہری نظر رکھتے، غالبا وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عرب علماء سے گہرے علمی روابط پیدا کیے حتی کہ ۱۹۱۲ء میں سید رشید رضا نے اجلاس ندوۃ العلماء کی صدارت کی، علمی مسائل پر تنقید، ملی مسائل پر تڑپنا، مسلمانوں کی حالت پر افسوس، حفاظت اسلام کا جذبہ، اشاعت اسلام کی کوششیں، مستشرقین کے اعتراضات کے جواب کی دھن، تحقیق و بحث کی عادت اور ان سب کاموں کو انجام دینے کے لئے ایسے افراد کی تیاری کا جذبہ تھا جس نے سید سلیمان ندوی اور بعض دیگر شخصیات کی تشکیل کی، جن کے متعلق خود شبلی نے کہا کہ ''اگر ندوہ نے صرف سلیمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے'' اور بعد میں اقبال نے کہا کہ ''علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد سید سلیمان ندوی سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے'' (۲)، آگے چل کر اسی ندوۃ العلماء نے ایک اور عالمی شخصیت کو جنم دیا جسے دنیا نے ابوالحسن علی ندوی کے نام سے جانا، میں بلاخوف تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ مولانا علی میاں علامہ شبلی نعمانی کے تخیلات کی تکمیل تھے، علامہ شبلی کے بہتیرے تصورات میں انہوں نے رنگ بھرا، بہت سے خاکوں کی تکمیل کی، ان کے طرز تحقیق سے استفادہ کیا، ان کے اسلوب کی جھلک ان کے یہاں نظر آتی ہے، ان کے تذکرے سے ان کی مجلسیں خالی نہیں رہتی، بلکہ تذکرہ کی کثرت یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان کی روح زیر بار احسان ہے اور ان کا قلم منت کش قلم شبلی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو! بقول ایک صاحب نظر کے:

''شبلی کی ہر تحریر اور ہر قول و عمل کو اگر وہ معنویت حاصل ہوئی.....تو یہ کہنا حق بجانب ہے کہ گزشتہ صدی کی اسلامی دنیا پر صرف اور صرف علامہ شبلی کے اثرات کی عملداری ہے، ابوالکلام آزاد ہوں اور محمد علی جوہر ہوں، سید سلیمان ندوی اور ان کا دارالمصنفین ہو یا مولانا مودودی اور مولانا علی میاں ہوں، گزشتہ صدی کے ہر سنگ میل پر شبلی موجود ہیں، ان کی معنویت نے خود کو عملا ثابت کیا ہے'' (۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سب پر شبلی کا اثر تھا لیکن علی میاں کی ادبی حس، تنقیدی شعور اور ملی تڑپ نیز عالمی مسائل سے دلچسپی میں شبلی کے مکمل اثرات پائے جاتے ہیں اور اس سلسلہ زریں میں سید سلیمان ندوی کو ایک سنہری کڑی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، کیوں کہ ایک طرف اگر وہ علی میاں کے

استادتو دوسری طرف شبلی کے تمام افکاراور جملہ تمناؤں کا مجسم پیکر تھے،علی میاں نے شبلی کی تمام کتابیں بچپن میں ہی پڑھ لی تھیں،شعور یالاشعور میں شبلی کے عکسِ سحر آگیں کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے سپاس گزار وقدر شناس اوران کے معترف تھے،اوران کی محبت سے دل معمور رہتا تھا، ذیل میں ہم علامہ شبلی کے ان تخیلات وتجاویز کا ذکر کریں گے جس میں علی میاں نے قولا ہی نہیں عملا رنگ بھرنے کا کام کیا ہے، وہ اعترافات بھی نقل کریں گے جن سے علی میاں پر شبلی کے اثرات، ان سے استفادہ اور ان کے تئیں احترام ومحبت کا اندازہ ہوگا۔

یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ بعض وجوہات کے سبب علامہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء سے مستعفی ہوکر گئے اور اپنی ساری توجہ دارالمصنفین کی تاسیس پر مرکوز کردی،جس کوان کی وفات کے بعدان کے شاگردرشید نے عملاً قائم کیااور نہ صرف یہ کہ استاد کے علمی وتحقیقی کاموں کومکمل کیا بالخصوص سیرت کی ایسی تکمیل کی اوراس کوعروج کی اس منزل تک پہنچایا جہاں اس کا کوئی ثانی نظرنہیں آتا، درحقیقت علامہ شبلی کا ندوۃ سے استعفیٰ ایک ناخوشگوار واقعہ تھااوراس سے یقیناً دارالعلوم کی روح نکل گئی مولانا علی میاں نے مولانا کے دور معتمدی کے متعلق دل کھول کرلکھا ہےاورخوب لکھا ہے:

''عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ایک ایسا شخص،جو ندوۃ العلماء کے مقاصد سے ذہنی طور پر آہم آہنگ ہواورتعلیم وتدریس کا عملی تجربہ رکھتا ہو،اسی کے ساتھ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کوابھارنے،ان کومناسب طریقہ پرنشو ونما دینے،اوران میں صحیح علمی ذوق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو،دارالعلوم میں مستقل قیام کرے،اساتذہ وطلباء سے اس کا براہ راست ربط ہو،اوروہ ان کے اورمجلسِ انتظامی کے درمیان رابطہ کا کام دے، علامہ شبلی معتمد دارالعلوم منتخب ہوئے تھے، اپنے عہدہ کے لحاظ سے بھی اور اپنی یگانہ صلاحیتوں اور علمی امتیاز کی بناپر بھی، وہ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے،اس لیے انہیں سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کریں،وہ جب علی گڑھ سے یکسواورحیدرآباد کے تعلق سے بددل ہوئے تھےاورندوۃ العلماءاوراس کے دارالعلوم کوانہوں نے اپنی تمناؤں کی تکمیل کا سب سے موزوں میدان سمجھا تھا، خود ان کی بھی خواہش تھی کہ وہ یہیں آکر بیٹھ جائیں اور اپنی ساری صلاحتیں اسی مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کردیں، جو ان کے فکر ونظر کے بھی مطابق تھااوران کی تعلیم وتربیت اور ذوق ورجحان کے بھی،ان کواپنے کوکلی طور پر یکسو کرنے کے لئے کچھ وقت لگا،لیکن بالآخر صفر ۱۳۲۳ھ (اپریل ۱۹۰۵ء) میں وہ باقاعدہ معتمد تعلیم کی حیثیت سے دارالعلوم کی عمارت (خاتون منزل، گولہ گنج) میں منتقل ہوگئے، اور باقاعدہ قیام شروع فرمادیا۔

علامہ شبلی کے دارلعلوم میں مستقل طور پر آجانے سے طلباء میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی،ان کی طاقتوراور دلآویز شخصیت طلباء کے سامنے خضر راہ بن کر آئی،ان میں مطالعہ،مضمون نگاری اورتقریر کا ذوق پیدا ہونے لگا، مطالعہ میں تنوع اور معلومات میں وسعت پیدا ہوئی،ان کی مجلسیں جوعلمی مسائل، کتابوں اور مصنفین کے تذکرے، کلامی وتاریخی مباحث اور

شعروسخن اور ادبی چاشنی سے کبھی خالی نہیں ہوتی تھیں، ہونہار طلباء کے لئے بڑی کشش رکھتی تھیں، اس کا نتیجہ تھا کہ ذہین و حوصلہ مند طلباء جو یوپی اور بہار کے پرانے علمی خاندانوں اور آسودہ حال گھرانوں سے ندوہ کو قدیم وجدید علوم کی ایک جامع درسگاہ سمجھ کر آئے یا بھیجے گئے تھے، ان کے گرویدہ اور عقیدت مند ہونے لگے اور مولانا کی بھی ان نوجوانوں پر، جن کو وہ جوہر قابل سمجھتے تھے، تربیت وعنایت کی خاص نظر رہتی اور ان کی اندرونی صلاحیتوں کو ابھارنے اور پروان چڑھانے میں مصروف رہتے، کسی سے مضمون لکھواتے، کسی کو تقریر کے لئے تیار کرتے، کسی کو مطالعہ کا مشورہ دیتے، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندوی، مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی (ایم۔ اے۔ علیگ وانسپکٹر مدارس عربیہ) مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، اور خود مولانا ابوالکلام آزاد، (جو ندوہ کے طالب علم کبھی نہیں رہے، لیکن ''الندوہ'' کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے دارالعلوم کی اسی عمارت میں مقیم اور مولانا کی علمی و ادبی مجلسوں کے مستقل شریک و حاضر باش تھے) مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، حاجی معین ا ین ندوی وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں، جو اپنی اپنی فطری صلاحتیوں اور ذوق کے مطابق نمایاں ونامور ہوئے۔

ندوۃ العلماء کے دائرہ کار، اس کے جلسوں کی رونق اور اس کے دارالعلوم کی توسیع وترقی میں بھی نمایاں اضافہ ہوا، رسالہ ''الندوہ'' کے وقار واعتبار (جو اس دور کا سب سے بلند پایہ علمی ودینی رسالہ سمجھا جانے لگا تھا) اور دارلعلوم کی شہرت میں بھی ترقی ہوئی، اشاعت اسلام کی تحریک (جو شروع سے ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں شامل تھی) میں بھی کچھ جان پیدا ہوئی، کچھ ایسی تجویزیں بھی ندوۃ العلماء کے جلسوں اور اس کے اسٹیج پر آئیں، جن سے لوگوں کو محسوس ہوا کہ ندوہ کی تحریک صرف ایک درسگاہ کے حدود میں محدود نہیں، بلکہ اس کا مسلمانوں کی پوری ملی زندگی سے تعلق ہے، مثلاً وقف علی الاولاد کے قانون کی ترتیب اور اس کے منظور کرانے کی کوشش، قرآن مجید کے تراجم پر اصلاحی وعلمی نظر، انگریزی کے ایک مستند ترجمۂ قرآن کی تکمیل، سرکاری مدارس میں دینیات کی تعلیم کا ندوۃ العلماء کی نگرانی میں انتظام، نماز جمعہ کے لئے مسلمان ملازموں کو چھٹی دیئے جانے کی تجویز وغیرہ وغیرہ، جس کے تخیل میں بلاشبہ علامہ شبلی کا وسیع اور بلند حوصلہ ذہن پیش پیش تھا'' (۴)

شبلی کے جانے سے یقیناً نقصان ہوا لیکن شبلی کی معنویت میں قطعاً کمی نہیں آئی، انہوں نے دارالعلوم میں اپنے جو نقوش و اثرات چھوڑے وہ آج بھی باقی ہیں، تحریر وتقریر کا ذوق، مطالعہ میں تنوع، کتابوں اور مصنفین کے تذکرے، علمی مسائل سے تعلق، نقد ونظر اور عربی رسائل وجرائد کا اجراء ومطالعہ سب شبلی کے کے ہی ذہن کی اپج ہے جو آج تک جاری وساری ہے، اور سچ یہ ہے کہ ان ساری خدمات کو مولانا میاں نے نہ صرف بہت خیر وخوبی سے انجام دیا بلکہ خوب پروان چڑھایا۔

اور جو اقتباس پیش کیا گیا اس کے آخری پیراگراف کو پڑھنے کے بعد اگر مولانا کی علمی زندگی پر نظر ڈالیے تو ان کی زندگی ان سطروں کی توضیح وتشریح اور مکمل وجامع تفسیر نظر آتی ہے، گویا شبلی کے لیے جو کچھ انہوں نے لکھا اس کو بہت سمجھ کر

لکھا، اور صرف لکھا نہیں بلکہ اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیا، دارالعلوم کا کتب خانہ شبلی کے نام سے موسوم ہے، دارالعلوم میں طلبہ کی تحریری مشق کے لئے قائم بزم آج بھی شبلی کے دور معتمدی میں طلبہ کی تحریری مشق کی یاد دلاتی ہے اور ان ہی کی طرف منسوب ہے، مولانا علی میاں بار بار شبلی کا تذکرہ کرتے ہیں، ان کی خودنوشت اس نام سے منور ہے، عشاء کے بعد طلبہ کے لئے ان کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں، اب وہ ''مجالس حسنہ'' کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں، ان مجلسوں کا سلسلہ بہت دراز ہے مگر صرف ۱۶۱ مجلسوں کو قید قلم میں لایا گیا ہے، گویا صرف ایک سال کی مجلسیں، لیکن آنکھیں یہ دیکھ کر خیرہ ہوجاتی ہیں کہ ہر تیسری، چوتھی مجلس میں شبلی کا ذکر خیر، یہ حقیقت ہے کہ معاصرت ایک حجاب ہے جس کے سبب بسا اوقات بعض شخصیات کو معاصرین میں وہ مقام نہیں ملتا جس کے وہ مستحق ہوتی ہیں لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ علامہ شبلی کو معاصرین نے بھی ان کی جلالت علمی کے ساتھ قبول کیا اور جو لوگ انہیں نہیں قبول کر پارہے تھے تو اس کا سبب بھی منجملہ دیگر اسباب کے شبلی کا علمی تفوق بھی تھا (۵) وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی معنویت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی نے جو سوچا اور جو لکھا اس کی پہلے سے کہیں زیادہ آج ضرورت ہے، اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھے یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ فکری اور نظری اختلافات ہر دور میں اور ہر جگہ ہوئے ہیں اور یہ شاید انسانی مزاج کا حصہ اور اس امت کی کمزوری ہیں، کوئی جماعت کتنی بھی متحد الخیال اور یکساں مقاصد کی علمبردار کیوں نہ ہو لیکن اختلاف مزاج، اختلاف ذوق ونظر، عمروں اور تجربوں کے تفاوت کے سبب آراء اور خیالات میں اختلاف سے کسی کو مفر نہیں اسی لیے غالبا واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم کے بعد واصبروا ان اللہ مع الصابرین (۶) (ترجمہ: اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہوجائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) (سورہ توبہ، آیت نمبر ۴۶) فرمایا گیا، سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اختلافات کا امکان ہر آن ہے اس سے صبر کا دامن تھام کر اختلاف سے بچا جا سکتا ہے، خلاف ذوق اور خلاف طبع امور کے خلاف امت کے مفاد میں اپنے آپ کو مائل کر لینا ہی صبر ہے، لیکن طاعت وفرمانبرداری کے شوق میں دائرۂ اعتدال میں رہنا اور صبر کو لازم پکڑنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، پھر بھی ان بزرگوں نے پیغام یہی دیا کہ فکری و نظری اختلافات سے تحریکات اور اداروں کو محفوظ رکھنا چاہیے، افسوس اس پر ہوتا ہے کہ بعض لوگ اختلاف کو تعصب میں بدل دیا کرتے ہیں، اور بزعم خود جورائے قائم کر لیتے ہیں پھر ہر عنوان کی تشریح اسی نظر سے کرتے ہیں، ایک صاحب نظر و صاحب بصیرت بزرگ نے علامہ شبلی کی دینی عظمت سپرد قلم کرنا چاہا تو ساتھ ہی یہ الزام بھی دے ڈالا ''ان کی دینی منزلت کو مسمار کرنے کے لئے ان کو متکلم، سوانح نگار، مؤرخ حتی کہ معتزلی بھی کہا گیا، اسی کا شاخسانہ ہے کہ ان کو مولانا کے بجائے علامہ قرار دیا گیا..... العلامہ شبلی .....

المعروف بمولانا شبلی النعمانی ..... الشیخ الفاضل ..... وکان معتزلیا فی الأصول ''(۷)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے یکسر یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا اور اگر کوئی کسی کو تسلیم نہ کرے تو اسے تحریک بھی نہیں بنایا جا سکتا، ہر شخص وصاحب نظر اپنی رائے اور انتخاب میں آزاد ہے، البتہ رائے کو صحت کے اصولوں پر پرکھا جا سکتا ہے لیکن اس کو شخصیت شکنی کی تحریک قرار دینا بالکل صحیح نہیں ورنہ متعدد متقدمین جن کا علم واتقاء مسلم ہے انہیں بھی اسی زمرے میں لانا پڑے گا، علامہ شبلی کی دینی عظمت مسلم تھی، یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ قدیم ذہن کے علماء انہیں روشن خیال عالم تصور کرتے تھے ورنہ ایک موقع پر تو ان کے فقہی اجتہاد کی تائید مشہور فقیہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے علی الاعلان کی، مولانا علی میاں نے علامہ شبلی کو متعدد جگہ مولانا شبلی ہی لکھا ہے، اور تاریخ ندوۃ العلماء میں شاید ہی کہیں علامہ شبلی لکھا گیا ہو، ہر جگہ مولانا شبلی رقم کیا گیا ہے جبکہ یہ تصنیف مولانا علی میاں کے دور نظامت کی دین ہے، مولانا علی میاں نے ہر آن اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اس کی مثال میں ان کے مثبت فکر کے غماز یہ دو جملے پیش کیے جاتے ہیں۔

وہ ارکان ندوہ کے درمیان اختلاف کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے، مخالفین کی طرف سے فرائض میں تساہلی کے اعتراض کو نقل کرتے ہیں تو بین القوسین لکھتے ہیں ''جس کو ہرگز وہ پسند نہ کرتے ہوں گے''(۸) حیات عبدالحی میں اپنے وا کی تنقید اور مزاجی خصوصیات کے باب میں جہاں مختلف اقتباسات نزہۃ الخواطر سے نقل کیے ہیں وہیں ایک ٹکڑا وہ نقل کیا جس میں علامہ شبلی کی بعض مزاجی خصوصیات وغیرہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن اس عبارت (۹) کو پیش کرنے سے قبل بین القوسین لکھتے ہیں ''جو راقم کے خیال میں کوئی عیب نہیں بلکہ وفور علم اور ذکاوت کا نتیجہ ہے'' مختصر یہ کہ انہوں نے (۱۰) علامہ شبلی کی وسعت فکری اور ان کے خوان یغما سے استفادہ کیا، ان کی مدح میں رطب اللسان رہے، اور کم از کم اپنی ذات سے ندوۃ العلماء کا وہ تعارف بھرپور کرایا جو شبلی کے تخیلات وتجاویز میں نظر آتا ہے، سچ کہا ہے وارث ریاضی صاحب نے ؎

وہ یادگار بزم سلیماں نہیں رہا
شبلی کے فکر وفن کا نگہباں نہیں رہا(۱۱)

مولانا علی میاں کے اعترافات

مولانا علی میاں نے علامہ شبلی سے جس طرح استفادہ کیا ہے اور ان کے تخیلات میں جس طرح رنگ بھرا ہے، ان کے تئیں ان کے یہاں جو عقیدت واحترام ہے اس کے متعلق ہم نے اوپر ذکر کیا کہ وہ بڑی کثرت سے علامہ شبلی کا تذکرہ کرتے ہیں، وہ ہندوستان میں علامہ شبلی کو جدید طرز تحقیق اور منفرد اسلوب اور ایک نئے ادبی اسکول کا بانی سمجھتے ہیں، وہ عام طور پر اپنے طلبہ کو مخاطب کر کے کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں علامہ شبلی کا اسلوب کی انفرادیت اور استدلال میں جو مقام ہے، عالم عربی میں احمد امین کا وہی مقام ہے، شبلی نے علمیت و ادبیت کا جو حسین امتزاج دنیائے اردو کو عطا کیا مولانا اسے ان کا کارنامہ شمار کیا کرتے تھے، ایک موقع پر علامہ شبلی کے متعلق ان سے استفسار کیا گیا تو وہ ان کا بے لاگ اور عقیدتمندانہ جواب سنیے:

''مولانا شمس الحق صاحب نے کہا: ایک رسالہ چھپا ہے،

علامہ شبلی اوران کے انکار حدیث کے موضوع پر لکھا ہوا ہے۔

حضرت نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: یہ سب تعصّبانہ باتیں ہیں کوئی تحقیق سے کسی حدیث کو قابل استدلال نہ سمجھے تو یہ اس کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے، حدیث سے استخفاف نہیں، آج کل اس قسم کے رسائل نکلتے ہیں جن کا کوئی حاصل نہیں!'' (۱۲)

مولانا نے یہ بھی اعتراف کیا ہے اور بڑا حقیقت پسندانہ اعتراف ہے کہ مولانا شبلی کی تحریک ندوہ میں شمولیت محض ایک جذباتی فیصلہ نہیں تھا بلکہ وہ کہتے ہیں:

''پھر علامہ شبلی جنہوں نے علی گڑھ میں انگریزی اساتذہ سے استفادہ کیا، مستشرقین کی تحریروں سے واقف ہوگئے اور جدید نسل پر اس کے جو اثرات مرتب ہوسکتے ہیں، اس کا ادراک کیا تو وہ بھی اس تحریک سے جڑ گئے''۔ (۱۳)

وہ جگہ جگہ علامہ شبلی اوران کی کتابوں کی مداحی کرتے نظر آتے ہیں بلکہ سراپا معترف نظر آتے ہیں کہ انہوں نے شبلی کو پڑھا ہے، پہنچانا ہے اور ان کی تقلید کی ہے، قادیانیت پر اپنی کتاب کے سلسلہ میں کہتے ہیں:

''دراصل کتاب کے لیے ندوی قلم درکار تھا، شبلی کا قلم، سید سلیمان ندوی کا قلم، ہم نے اسی کی کوشش کی ہے، ندوے کے بانیوں اور ذمہ داروں نے جو اسلوب اختیار کیا تھا، وہ جدید نسل کے لیے مفید ہے۔'' (۱۴)

اور یہ اعترافات یوں ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے مولانا کی کتابوں کو پڑھ کر یہ اسلوب، یہ رنگ اور فکریں اخذ کی تھیں ایک موقع پر فرمایا:

''آب حیات، ہم نے کئی بار پڑھی تھی، اور ''گل رعنا'' تو گھر ہی کی تھی، اسی طرح مولانا شبلی کی کتابیں بھی بچپن ہی میں پڑھ لی تھیں، ہمارے ایک چچا تھے سید فاروق صاحب وہ یہاں کے فاضل تھے، ان کے پاس علامہ شبلی کی کتابیں تھیں، ایک ہی گھر میں رہتے تھے، ہمیں ان کی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا، ہم جب پندرہ سولہ سال کی عمر میں لاہور گئے تو بہت سی باتیں زبانی بتادیتے تھے، لوگوں کو بڑا تعجب ہوتا تھا۔'' (۱۵)

ایک مرتبہ استفسار کیا گیا کہ:

''الفاروق'' آپ کی پسندیدہ کتابوں میں سے ہے؟ تو فرمایا: ''بہت کم کتابیں اس کے مقابلے کی ہوں گی، تاریخ نویسی میں علامہ شبلی کا اسلوب اس میں سب سے زیادہ اجاگر ہے، یہ بڑی موثر کتاب ہے،.....صاحب (معلوم نہیں کس کی طرف اشارہ ہے مجالس کے مرتب نے بھی اشارہ نہیں کیا ہے) جب جیل میں تھے، تو انہوں نے اس کتاب کے ذریعے بہت سے کیمونسٹوں کے خیالات تبدیل کیے۔'' (۱۶)

''اورنگ زیب بہت بڑا شخص تھا، ان پر اس حیثیت سے کام بہت کم ہوا، علامہ شبلی کی کتاب 'اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر' اور دوسری بعض تحریریں اور بس۔'' (۱۷)

ایک مجلس میں فرمایا:

''ہم نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا، وہ ٹھوس اور بنیادی کتابیں تھی، ہم نے احمد امین کی یہ کتابیں پڑھیں اور حرف بہ حرف پڑھیں، اس سے ہم کو دو فائدے ہوئے: ایک اس کی ادبیت، دوسرے اس کا علمی اسلوب اور زبان، جیسے ہمارے یہاں علامہ شبلی اور ومولانا مودودی کا طرز ہے۔ ہم نے اس

اسلوب کو پوری طرح اخذ کرلیا اور ہماری تحریروں میں اس کا اثر آیا، اور یہ بھی خدا کی طرف سے انتظام تھا، ورنہ ماذا اخسر جیسی کتاب کے لئے صرف ادبیت کافی نہیں تھی، علمی زبان ضروری تھی، اس سے بھی پہلے ہم منفلوطی کی ''النظرات'' اور رافعی کی ''وحی القلم'' اور احمد حسن زیات کی ''وحی الرسالۃ'' پڑھ چکے تھے، جو معیاری ادب کی کتابیں ہیں۔'' (۱۸)

''مولوی اسمعیل میرٹھی نے اردو کی بڑی اچھی کتابیں لکھی تھیں ''سفینۂ اردو'' وغیرہ، علامہ راشد الخیری کی کتابیں ''صبح زندگی'' شام زندگی'' وغیرہ بھی ہم نے پڑھیں، انکا ادبی فائدہ ہوا، ان کتابوں کو ہم نے گیارہ بارہ سال کی عمر میں پڑھ لیا تھا پھر ''آب حیات'' مولوی محمد حسین آزاد کی پڑھی، جادو والی زبان ہے، اور نیرنگ خیال'' بھی پڑھی جو ایک ادبی شاہکار ہے، پھر ''گل رعنا'' وا صاحب کی جو گھر ہی کی تھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کچھ کتابیں اور مولانا شبلی کی کتابیں پڑھیں جس میں ادبیت بھی ہے اور تاریخ بھی۔ حضرت ابوبکر کی سیرت پر مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی کتاب ''سیرۃ الصدیق'' بہت جامع اور مؤثر ہے، حضرت عمر پر علامہ شبلی کی ''الفاروق'' کا کیا کہنا اور حضرت عثمان کی سیرت پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ''عثمان ذوالنورین'' ایک اچھی کتاب ہے، ہمیں مولانا شبلی کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا علامہ شبلی کی کتابوں میں ''شعر العجم'' بہت ممتاز ہے ہمیں بچپن ہی میں ایسی کتابوں کو پڑھنے کا موقع مل گیا عموما اس عمر میں وہ کتابیں پڑھی نہیں جاتیں (۱۹)

مولانا کو دارالمصنفین سے جو ربط و تعلق تھا اس کا انکار مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ہاں اپنے نظریات کے سبب ہم کچھ بھی منسوب کردینے میں آزاد ہیں، یہ اس دارالمصنفین سے تعلق کی بات ہے جو علامہ شبلی کے فکری تخیل کا مرقع، ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کے طائر شوق کا نشیمن اور ان کی آخری کوششوں اور امیدوں کا مرکز ہے، اس کی قدر شناسی، اس کا احترام اس سے متعلق رہ کر اور اس سے باہر رہ کر جس طرح انہوں نے اس کے مشن کو فروغ دیا اور اس کی علمی روایت کی حفاظت کی اور اس کی عظمت کو قائم رکھا وہ ان ہی کا حصہ ہے، ان کو علامہ شبلی کی علمی عظمت کا اعتراف تھا، ان کے طرز تحقیق کے وہ مداح و معترف تھے اور اس بنا پر وہ دارالمصنفین کی مداحی کیا کرتے تھے، سید سلیمان ندوی سیمینار میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''اور یہ مولانا شبلی کی ان روایات میں سے ہے کہ بغیر حوالے کے کوئی بات نہ کہی جائے، منقولہ بات جہاں تک ممکن ہو اس کے مصنف کے الفاظ میں نمایاں کی جائے وغیرہ، مجھے یاد ہے کہ سید صاحب کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے بعض فضلاء بڑے زود نویس اور بہت اچھے لکھنے والے تھے اور ان سے علامہ شبلی کے تعلقات و روابط بھی تھے، میں نے بعض مرتبہ ذکر کیا کہ فلاں صاحب سے کام لیا چاہیے، تو مولانا شبلی نے فرمایا کہ ان کی بیماری یہ ہے کہ وہ حوالہ نہیں دیتے، اردو میں حوالہ دینے کی روایت کا اہتمام غالبا سب سے پہلے مولانا شبلی نے کیا جو اب ایک مسلم اصول بن گیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کو دارالمصنفین نے قائم رکھا اور اس مسلک تصنیف و تحریر کے تمام پیروکار بھی اس کو قائم رکھے ہوئے ہیں''۔ (۲۰)

ان کو جو تعلق اس عظیم ادارے سے تھا اسے ان کی مختلف تحریروں اور تقریروں میں محسوس کیا جا سکتا ہے، دارالمصنفین کے استشراق و مستشرقین سیمینار میں اپنے مقالہ ''اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین'' کے موضوع پر جو مقالہ (۲۱) پیش کیا اس میں دارالمصنفین علامہ شبلی اور سید صاحب کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کا حرف حرف ان کے احساس ممنونیت اور اعتراف کا شاہد ہے، ان کے اس تعلق کو مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے تعزیتی شذرہ کے اس اقتباس میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے، البتہ مذکورہ بالا صراحتوں کے باعث ان کے اس خیال سے اتفاق ممکن نہیں کہ مولانا کو دارالمصنفین سے محض سید صاحب اور مسعود علی صاحب سے عقیدتمندانہ تعلق کی بنا پر محبت تھی مولانا اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

''ہندوستان اور عالم اسلام کے بے شمار اداروں سے ان کا تعلق تھا، ہر ادارہ ان سے اپنی نسبت کو فخر سمجھتا تھا، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے ان کو گہرا اور مخلصانہ لگاؤ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے عقیدت مندانہ تعلق کی بنا پر وہ اس کے کاموں میں پیش پیش رہتے اور پوری دلچسپی لیتے، اس کی ترقی و کامیابی سے خوش ہوتے، وہ اور ان کے بڑے بھائی اس کی مختلف مجالس کے رکن تھے، ڈاکٹر سید محمود اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے انتقال کے بعد مجلس عاملہ کا صدر بنایا گیا، ان کے، ڈاکٹر سید محمود اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے بعد وہی اس کے روح رواں تھے، بڑی پابندی سے دارالمصنفین کے جلسوں میں تشریف لاتے، اس کے جشن طلائی اور اسلام و مستشرقین پر بین الاقوامی سیمینار کو کامیاب بنانے میں انہوں نے پوری سرگرمی دکھائی، یہاں سے ان کے وا بزرگوار کی کتاب گل رعنا، الثقافۃ کا اردو میں ترجمہ شایع ہوا، خود ان کی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت کے شروع کے دونوں حصوں کا پہلا ایڈیشن یہیں سے نکلا، معارف پابندی سے پڑھتے، کسی مہینے میں تاخیر ہوتی تو شکایت کرتے، ابھی جلد ہی ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا پسندیدہ رسالہ کون ہے، تو جواب دیا معارف، دارالمصنفین کو مالی فائدہ بھی پہنچاتے، یوپی کے وزیر اعلی ریتا بہوگنا نے ندوۃ العلماء کو ایک لاکھ روپے دیے تو اسے دارالمصنفین کی طرف منتقل کرادیا، مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی حصہ ہفتم کا مقدمہ انہوں نے لکھا تھا، یہ کتاب جنرل ضیاء الحق مرحوم کو بہت پسند آئی تھی، اور انہوں نے مولانا کو ایک لاکھ روپے نذر کرنا چاہا تو فرمایا کہ میں اس کا مستحق نہیں، دارالمصنفین اور سید صاحب کی بیگم ہیں چنانچہ نصف نصف رقم دونوں کو ملی، حال ہی میں ابوظہی اور برونائی کی حکومت سے ان کو خطیر رقم ملی اسے انہوں نے مدارس میں تقسیم کر دیا، اس موقع پر بھی دارالمصنفین کا خیال رکھا، ان کی سفارش سے اسے رابطہ عالم اسلامی سے ایک اچھی سالانہ رقم ملتی تھی، مگر عرصے سے وہ بند ہوگئی۔'' (۲۲)

۱۹۸۲ء کے جس سیمینار کا تذکرہ اوپر آیا اس سے دس روز قبل مولانا کے عزیز بھانجے مولانا ثانی حسنی کا انتقال ہوگیا، ایسے موقع پر سیمینار کی کامیابی کی فکریں اور کسی ادارے کے تعلق کا کیا سوال! لیکن یہ مولانا کا دل دردمند، علم دوست مزاج اور ان کا خلوص وللّٰہیت ہے جس کو صباح الدین صاحب کے الفاظ میں پڑھیے:

''اس کے انعقاد سے دس روز پہلے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے محبوب بھانجے اور مولانا رابع ندوی کے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی کی وفات ہوگئی، تو اس سے دارالمصنفین کے خدمت گزاروں پر بجلی گری، خیال ہوا کہ اس الم ناک حادثہ کے بعد اس مذاکرہ کو ملتوی کر دینا ہی بہتر ہوگا مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا رابع ندوی دونوں نے اپنے بے مثال صبر و ضبط سے کام لے کر ایسا ہونے نہیں دیا'' (۲۳)

جب مولانا کو فیصل ایوارڈ ملا اسی کے چند روز بعد دارالمصنفین کی انتظامی مجلس منعقد ہونا طے تھی، اس وقت کے ناظم صباح الدین صاحب نے مولانا کے لے ایک مجلس استقبالیہ کا اہتمام کیا، مولانا اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں کہ مجھے اس پر شرمندگی ہوئی، میں جب شکریہ ادا کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو میں نے اپنی تقریر کا آغاز محمود وایاز کے اس قصہ سے کیا جس کا ایک فقرہ ''ایاز قدر خود را بشناس'' مولانا نے آگے جو کچھ لکھا وہ ان کی قدیم عقیدت مندی اور اس مقام پر پہنچ کر بھی سعادت مندی اور عظیم فکری و علمی ادارے سے نسبت پر فخر کے اظہار کے ساتھ اس کا بھی ثبوت ہے کہ وہ حقیقت پسند تھے، انہوں نے اپنے عنوان شباب کا تذکرہ کیا اور اس حیثیت سے کیا کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اس ادارے کے فکری تخیل سے ہم آہنگ تھے بلکہ اس کی خدمت اور اس سے نسبت کے خواہاں تھے، مولانا لکھتے ہیں:

''میں نے کہا میں نے بھی اپنی پرانی گدڑی (ابتدا کی بے نوائی اور بے حقیقتی) محفوظ رکھی ہے، اور میں بھی اس کو سامنے رکھ کر ''ایاز قدر خود را بشناس'' کہہ لیا کرتا ہوں، یہ گدڑی یہ ہے کہ ۱۹۳۱ء میں جب اپنے استاد علامہ تقی الدین الہلالی کے ساتھ خادمانہ یہاں حاضر ہوا تھا تو میں نے ان کے ذریعہ اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا مجھے یہاں کم سے کم مشاہرہ پر (جس کی مقدار میرے نزدیک اس وقت ۲۵-۳۰ روپیہ بھی ہو سکتی تھی) رکھ لیا جائے، اور میں کوئی خدمت انجام دوں، لیکن میں اس وقت اس کا بھی اہل نہیں سمجھا گیا، آج اسی عظیم ادارہ کی طرف سے یہ پذیرائی اور عزت افزائی ہو رہی ہے، لیکن الحمدللہ میں اپنی حقیقت سے واقف ہوں، مجھے اپنا ماضی یاد ہے اور میں اپنے بارے میں کسی فریب میں مبتلا نہیں، اس لیے اپنے نفس کو مخاطب کر کے میں اب بھی کہہ رہا ہوں، ''ایاز قدر خود را بشناس'' ''ایاز قدر خود را بشناس'' اور اسی میں اپنی حفاظت اور سلامتی سمجھتا ہوں'' (۲۴)

اسی دارالمصنفین میں جب استشراق و مستشرقین پر سیمینار ہوا تو استقبالیہ تقریر میں ان کے یہ جملے ملاحظہ کیجئے:

''اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سب سے پہلا سیمینار ہندوستان ہی میں ہونا چاہئے تھا، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ ٹھوس اور سب سے قیمتی کام یہیں انجام پایا اور پھر ہندوستان میں ہونا تھا تو اعظم گڑھ ہی سب سے موزوں جگہ تھی اور مزار شبلیؒ ہی سے چند گز کے فاصلہ پر اور دارالمصنفین کی دیوار کے سائے میں ہونا چاہئے تھا، لیکن حضرات! ہمیں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ

گماں مبر کہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

علم و تحقیق کا کوئی کام آخر نہیں ہوتا ہے، علم میں کوئی چیز

آخری نہیں کہی جا سکتی، علامہ شبلیؒ کی خدمات آج بھی دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں، ان کی سیرۃ النبی اور الفاروق آج بھی بے مثال ہیں، الجزیہ فی الاسلام، حقوق الذمیین، کتب خانۂ اسکندریہ اور اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر آج بھی اہمیت کی حامل ہیں، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کتب خانۂ اسکندریہ پر جب ان کا مضمون شائع ہوا تو کالج کے مسلمان طلبہ کا سر فخر سے اٹھ گیا، وہ رات دن یہ طعنہ اپنے انگریز استادوں سے سنا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے کتب خانۂ اسکندریہ کو جلا دیا، اس میں آگ لگادی، مسلمان طلبہ اب ان کو فخر کے ساتھ جواب دینے لگے، اب ڈاکہ ہٹی نے بھی اپنی کتاب ''اے شاٹ ہسٹری آف دی عرب'' میں بڑے مدلل طریقے سے اس کا انکار کیا، اب کوئی صاحب علم اس کے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے اس کتب خانہ کو جلایا، لیکن ہم آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ علامہ شبلی کے مضمون سے پہلے مسلمان طلبہ کو کس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ان کو اٹھتے بیٹھتے یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ مسلمان تو علم دشمن ہیں، علم سوز ہیں، کتاب سوز ہیں لیکن مولانا شبلیؒ کے مدلل مضمون کے بعد ان طعنہ زنوں کو مسلمان طلبہ خاموش کر دیا کرتے تھے'' (۲۵)

اس میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی کہ مولانا علی میاں کو ان کا متصوفانہ رنگ بھی خرمن شبلی کی خوشہ چینی سے نہ روک سکا، خود انہوں نے قولا وعملا اور تحریری طور پر بھی بار بار اس کا اعتراف کیا ہے، ندوۃ العلماء میں دارالاقامہ کی ایک عمارت علامہ شبلی کے نام سے موسوم ہو چکی تھی لیکن جب مولانا کے دور نظامت میں دارالعلوم کے کتب خانہ کی عظیم الشان اور پرشکوہ عمارت تعمیر ہوئی تو اس کا نام بھی علامہ کے نام پر رکھا، یہ نہ صرف ان کا اخلاص اور شبلی کی عظمت کا اعتراف تھا بلکہ شبلی کے کتابوں سے شغف اور ندوے میں ذخیرۂ کتب کی فراہمی کے لئے ان کی کوششوں کا اعتراف بھی تھا اور ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار بھی تھا کہ واقعی بانیان ندوہ میں وہی اس کے مستحق تھے کہ کتب خانہ کو ان کے نام سے موسوم کیا جائے۔

مولانا کے حسن اعتراف، حسن انتخاب اور علامہ شبلی کے فکر وفن سے تعلق پر یہ ایک چھوٹا سا بہ ظاہر بے معنی لیکن در حقیقت بہت بامعنی واقعہ بھی دلیل ہے، ایک مرتبہ مولانا علی میاں صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اور شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب کی معیت میں اس جگہ سے گزر رہے تھے جہاں دارالمصنفین کے اہل علم واہل قلم کی تربتیں ہیں، شاہ صاحب نے کہا لوگ پوچھتے ہیں کہ علامہ شبلی کی قبر کس جگہ ہے، اس لیے سوچتا ہوں کہ سرہانے ایک کتبہ لگا دیا جائے شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ابھی ہم لوگ سوچ ہی رہے تھے کہ کتبہ پر کیا لکھا جائے، مولانا علی میاں نے برجستہ کہا کہ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے یہی لکھ دیجئے ۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا(۲۶)

علمی و ادبی اسلوب میں استفادہ:

اوپر جو اعترافات نقل کیے گئے ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے علامہ شبلی کے طرز تحقیق کو اپنایا ان کے سحر آمیز

سنجیدہ علمی و ادبی اسلوب سے استفادہ کیا، آئندہ سطروں میں مفصل ذکر آئے گا کہ تقریباً ہر کتاب اسی مقصد سے تصنیف کی جو مقاصد تصنیف علامہ شبلی کے ہوا کرتے تے، مولانا شبلی نے سیرت کی شکل میں جو کارنامہ انجام دیا تھا اور خدمت سیرت کی جو طرح ڈالی تھی اس کا اثر مولانا پر یہ تھا کہ اس قبیل کی کوئی بات ہو مولانا شبلی کا ذکر اور ان کی سیرت کا تذکرہ نوک قلم پر آجاتا، دیکھیے مولانا علاء ا ین ندوی صاحب کی کتاب ''ہجرت مصطفیٰ'' کے مقدمہ میں کیا لکھتے ہیں اور اپنی نسبت کس سے کرتے ہیں۔

''یہ بھی ایک قابل شکر و اعتراف حقیقت ہے کہ جس ادارے اور مکتب خیال کے بانیوں اور سر پرستوں نے سیرت النبی کو اپنا موضوع بنایا تھا اور علامہ شبلی کی سیرت النبی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی خطبات مدراس (معذرت کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ) ایک اور ندوی فاضل اور منتسب کی عربی میں السیر ۃ النبویۃ وجود میں آئی اور اس نے عالم عربی کی جامعات میں مؤقر جگہ پائی اسی ادارے کے ایک فاضل اور جواں سال فرزند کے قلم سے یہ مؤقر کتاب ہجرت مصطفیٰ نکلی'' (۲۷)

مولانا علی میاں کو عام طور پر لوگ مفکر، سیر و سوانح نگار سمجھتے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا ادبی ذوق بہت صاف اور بلند تھا، ان کی تنقیدی عبارتوں میں صاف شبلی کا رنگ کمال اور عکس حسن و جمال نظر آتا ہے، وہ جب بھی ادبی موضوعات پر قلم اٹھاتے تو شبلی کی شیشہ گری کا عکس نظر آتا، اقبال کا جس شان سے عالم عربی میں تعارف کرایا وہ کسی پر مخفی نہیں، اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور اور سخت گیر ناقد ماہر القادری نے کہا کہ:

''اس کتاب میں شبلی کا قلم کارفرما ہے کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص اس میں کارفرما ہے''۔ (۲۸)

مولانا علی میاں کی تنقیدی بصیرت میں شبلی کا عکس کس قدر موجود ہے، ان کی زبان میں سادگی کے حسن، ستھرے ذوق کے ساتھ انداز بیان کتنا صاف و پرکشش ہے اس عبارت کو پڑھ کر اندازہ کیجئے:

''مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کا یہ بہت بڑا علمی و ادبی کارنامہ اور اردو پر احسان ہے کہ آب حیات لکھ کر انہوں نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی، وہ اردو زبان و ادب اور شاعری کے گہوارے میں پلے تھے اور اردوئے معلیٰ کے اجڑنے سے پہلے اس کی بہار دیکھی تھی، استاذ ذوق جیسے استاد کے عزیز شاگرد تھے، ذوق، غالب، مومن اور شیفتہ کی مجلس اور بے تکلف صحبتیں دیکھی تھیں، لکھنو بھی وہ اس وقت آئے تھے جب ناسخ و آتش کے تذکروں سے مجلسیں گرم اور دبیر و انیس کی خوش نوائی سے لکھنو کا چمن بول رہا تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پیدائشی طور پر سخن شناس تھے، ان کا خمیر شعر و ادب سے اٹھا تھا، اور اس کا ذوق ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گیا تھا، پھر وہ اس درجہ کے انشاء پرداز تھے کہ ان کی انشاء پردازی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے کلاسکل ادب اور ان کے ادبی شہ پاروں سے آنکھیں ملاتی ہے، ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا سید عبدالحی نے گل رعنا میں ان کے متعلق جو لکھا ہے اور ان کے اس یگانۂ کمال کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس پر اضافہ مشکل ہے''۔ (۲۹)

اس صاف ستھری زبان اور ذوق سلیم کا غماز انداز بیان دیکھنے کے بعد شیخ شرف الدین یحیی منیری کے مکتوبات کی ادبی قدر و قیمت پر مولانا کا تبصرہ ملاحظہ کیجئے:

''ناقدین ادب نے ماحول فضاء اور طبیعت کے فراغ کو ادب وشاعری کے لئے بہت زیادہ سازگار معاون عنصر تسلیم کیا ہے، اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ لب جو، کنارۂ دریا، گوشۂ چمن، فصل بہار، نسیم سحر، صبح کا سہانا وقت، ان کی شاعری اور ان کے ادب کے لئے محرک بن جاتا ہے اور ان میں بہت سے لوگ ایسے مقام کی تلاش اور ایسے وقت کے انتظار میں رہتے ہیں اسی طرح یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی کہ روح کی لطافت اور دماغ کا سکون ادبیات کے لئے بہت معاون ہے۔ بعض اہل دل کے کلام میں جو غیر معمولی حلاوت و قوت ہے وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی اور اندرونی کیفیت و سرمستی کا نتیجہ ہے، اور اس کے لئے وہ کسی خارجی مدد اور مقام اور وقت کے محتاج نہیں ہوتے، ان کی خوشی و سرمستی کا سرچشمہ، اور ان کی دولت کا خزانہ ان کے دل میں ہوتا ہے، خواجہ میر درد نے جو خود صاحب دل اور صاحب درد تھے، اس پورے گروہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے۔

جائیے کس واسطے اے درد مئے خانہ کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانہ کے بیچ (۳۰)

ان اقتباسات میں علامہ شبلی کا رنگ کس قدر موجود ہے ان کے اسلوب سے کس حد تک استفادہ ہے، اس کے لیے علامہ کی ایک عبارت دیکھیے:

''بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب و ہوا سرسبزی اور شادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعہ سے انشا پردازی اور شاعری تک پہونچتا ہے، عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ جنگل، صحرا، بیاباں دشوار گذار راستے، مٹے ہوئے کھنڈر، ببولوں کے جھنڈ، پہاڑی جھاڑیاں، یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ لیکن یہی عرب جب بغداد پہونچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا'' (۳۱)

مولانا کے اعترافات کے بعد یہ شہادت دینے کی چنداں ضرورت نہیں کہ انہوں نے اس میدان میں علامہ سے استفادہ کیا ہے، بطور نمونہ یہ دو ٹکڑے پیش کر دیے گئے ورنہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے علامہ کی علمی و ادبی دعوت و تبلیغ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور تاحیات اسی کے فروغ میں لگے رہے، ان کو شعر گوئی کا ملکہ تو نہیں حاصل تھا لیکن شعر فہمی میں ان کا شعری ذوق صاف محسوس ہوتا ہے، دراصل شبلی ایک چراغ تھے جس سے بے شمار چراغ جل اٹھے۔ علی میاں بھی ان میں سے ہیں، جنہوں نے شعر العجم سے استفادہ کیا، کون کہتا ہے کہ ان کے شعری ذوق کو پروان چڑھانے میں اس کتاب اور اس کے مصنف کا حصہ نہیں، اشعار کو انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑ دیتے ہیں، سادہ بیان مگر کشش بلا کی، بہت ممکن ہے کہ شبلی کے مطالعہ کا نتیجہ ہو اور اسی لیے وہ ان کے قلم گرویدہ و شیدائی بھی نظر آتے ہوں، انہوں نے تاحیات شبلی کی متاع قلم کو سنبھال سنبھال کر رکھا اور جب جب ضرورت ہوئی اسی کی مدد سے علم وملت کی آبیاری کرتے رہے، انہیں شبلی کی متاع قلم کے علاوہ شبلی کی ملی تڑپ بھی ورثہ میں ملی تھی، اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان و بیان کی شرافت اور ملت کے لئے تڑپ مولانا علی میاں پر ختم ہوگئی۔

سیاسی و ملی شعور:

علامہ شبلی نعمانی کی سیاسی زندگی درحقیقت ان کے ملی شعور سے عبارت تھی، انہیں اسلام کی حکومت عزیز تھی، وہ اس کے زوال پر ماتم کناں بھی تھے اور سچ یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی اسی اجڑے چمن کو شاداب کرنے اور دوبارہ آباد کرنے اور اپنی قوم کے مستقبل کو ان کے ماضی سے جوڑنے میں گزری۔ وہ اس وقت کے ہندوستان میں معروف اور عالم اسلام کے حالات سے باخبر تھے، انہیں ممالک اسلامیہ کی سیاحت کا موقع ملا تھا، عالم عربی و اسلامی سے ان کے روابط تھے، قدیم وجدید کے رمز شناس اور وسیع المطالعہ تھے لیکن سیاسیات کے باب میں وہ اسلام کی جمہوریت کے قائل ہونے کے باوجود اسلام کی حکمرانی کی خاطر سلطنت عثمانیہ کے زوال پر آنسو بہاتے ہیں، ترکی کی طرف امید افزا نظر ڈالتے ہیں، ان کی زندگی کے اس پہلو کو کیلئے سید صاحب کا یہ اقتباس کافی ہے:

''گو سیاسیات کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا، تاہم وہ سیاسیات کے ہمیشہ د ادہ رہے لیکن ان کے سیاسیات کا یہ رقبہ بھی حقیقت میں ان کے کلامیات ہی کی وسعت کا ایک جز تھا، یعنی ان کو اسلامی تمدن، اسلامی علوم وفنون سے جو شیفتگی تھی، اس کا فطری اقتضا یہ ہونا چاہیے کہ ان کو اسلام کی حکومت عزیز ہو اور جی چاہتا ہو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رہتے ہیں، اس کو وہ مجسم بھی دیکھ سکتے، دوسری طرف چمن اسلام کے پھولوں کو جن گستاخ ہاتھوں نے نوچ ڈالا، ان کی طرف سے ان کو پورا انحراف ہو، یہی ان کی سیاست تھی، ایک طرف وہ یورپ کی علمی سرپرستی کے لیے سراپا سپاس تھے، دوسری طرف یورپ کی دست برد سے ہمہ تن فریاد اسی جذبہ نے ہندوستانی سیاست کی ایک دوسری شکل ان کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ یہ ملک ہندو مسلمانوں کا متحدہ وطن ہے، لیکن اسلامی سیاسیات میں وہ پورے پین اسلامی تھے۔'' (۳۲)

اس پس منظر میں علامہ شبلی کو اسلام کا شکوہ صرف ترکی میں نظر آتا تھا، انہوں نے کسی تحریک وتنظیم سے وابستہ ہونے سے بہت پہلے اپنے سیاسی وملی نظریہ کا اس طور پر ثبوت دیا کہ ۱۸۷۶ء کی روس و روم جنگ کے دوران تمام ہندوستانی مسلمانوں کی طرح ترکوں کے لئے چندہ اکٹھا کر کے بھیجا، آگے چل کر جب سیاحت کا موقع ملا برٹش گورنمنٹ کی نگاہ میں جرم ہونے کے باوجود اپنا سفرنامہ شائع کیا، سید صاحب لکھتے ہیں:

''۹۶-۱۸۹۵ء میں جب آرمینیا کا مسئلہ اٹھا اور اس سلسلہ میں یورپ کا ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بافی کر کے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا اور ہندوستان کے اخباروں میں اس کی نقلیں چھپ رہی تھیں تو مولانا سے ضبط نہ ہوسکا، انہوں نے ۲۱ر فروری ۱۸۹۶ء کے آزاد اخبار لکھنؤ میں ایک زبردست مضمون لکھا اور حقیقت کا پردہ چاک کیا، یہ وہ وقت تھا جب مولانا علیگڑھ کالج کی ملازمت میں تھے۔ ۱۸۹۷ء میں روم ویونان کی جنگ جب پیش آئی تو وہ علی گڑھ میں تھے اور سرسید کا نقطۂ نگاہ سب کو معلوم ہے، گو مولانا نے اس موقع پر اپنے کو قابو میں رکھا لیکن ان کو علی گڑھ کی فضا میں اندر سے گھٹن ہونے لگی اور نتیجہ اس قسم کی سیاسی کشمکش کا علاحدگی تھا۔'' (۳۳)

۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کیا تو مولانا

تڑپ اٹھے اور یہ موضوع ان کے ذہن وفکر پر سوار ہوگیا، ان کے سب سے بڑے سوانح نگار کا بیان ہے:

''پھر دفعۃ جب ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو ان کے دل میں ٹھیس سی لگی، اس زمانہ میں ان کا رہ رہ کر اضطراب اور باتوں باتوں میں شعلہ نفسی مجھ کو اچھی طرح یاد ہے، ہر ہفتہ جب مصر کے عربی اخبارات آتے تھے تو ما سوا سے بے خبر ہوجاتے تھے اور ترک بہادروں کی جاں بازی اور شجاعت کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے، انور بے، عزیز بے مصری اور دوسرے نوجوانوں ترک افسر جو اٹلی کی ناکہ بندیوں کے باوجود اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چھپ چھپ کر طرابلس پہنچ رہے تھے، ان کی اس جواں مردی کے قصوں کے دہرانے میں اس بڑھاپے میں بھی ان میں جوانی کی اکڑ پیدا ہوجاتی تھی۔

طرابلس کی اس لڑائی کے زمانہ میں ساری دنیائے اسلام میں یورپ کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، ہندوستان کا بر اعظم اس زمانہ میں اسلامی جوش وخروش کا طوفان خیز سمندر بن گیا تھا، یاد ہوگا کہ ٹرکی نے اٹلی سے اس بات پر صلح کر لی تھی کہ ترک طرابلس کو خود مختار بنا دیں اور وہ جس طرح چاہے اٹلی سے نپٹ لے، چنانچہ باب عالی نے اس کے مطابق طرابلس کو خود مختاری بخش دی اور شیخ سنوسی وغیرہ نے اس کی آزادی کا بیڑا اٹھایا، مجھے اسی زمانہ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ یاد ہے، رات کو تقریبا آٹھ نو بجے بے وقت مولانا کا رقعہ آیا، جس میں مجھے اور اونچے درجہ کے دو تین طالب علموں کو یاد فرمایا تھا، ہم سمجھے کوئی ضروری بات پیش آئی ہوگی جو اس وقت طلب فرمایا ہے، ہم لوگ بتمام عجلت پہنچے تو دیکھا کہ خود چٹائی پر لیٹے ہیں، سامنے لیمپ ہے اور چاروں طرف عربی اخبار پھیلے ہیں، ارشاد ہوا ''بھائی سنا؟ بڑا مزا ہوا، عربی اخبار آئے ہیں ان میں انور بے وغیرہ کا اعلان ہے کہ وہ ٹرکی کی خدمت سے استعفا دے کر طرابلس میں اپنی نئی حکومت بنائیں گے اور اخیر وقت تک اٹلی کا مقابلہ کریں گے، اس خبر سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا تھا، مگر اکیلے ہنستے نہیں بنتا تھا، اس لیے تم لوگوں کو بلوایا ہے'' یہ کہہ کر صندوقچہ سے روپیے نکالے اور آدمی بھیج کر بازار سے مٹھائی منگائی، خوشی ومسرت کا یہ جلسہ دیر تک قائم رہا، حالاں کہ مولانا عموما نو بجے سو جانے کے ہمیشہ سے عادی تھے۔'' (۳۴)

۱۹۱۲ء میں جب یورپ کی سلطنتوں کی شہ اور مدد کے سبب بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کیا تو مولانا کے اسلامی جذبات ابل پڑے، عمر کے اس مرحلہ میں اسلامی جوش نے ان کو جوان کر دیا، انہوں نے اس موقع پر ''شہر آشوب اسلام'' جو نظم لکھی وہ خون کے آنسو رلاتی ہے، عظمت رفتہ کا ماتم کرتی ہے، دامن ملت کو آنسوؤں سے تر کرتی ہے، ایک نیا جذبہ پیدا کرتی ہے اور ہر ذی شعور کو تڑپ جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
زوالِ دولت عثماں زوالِ شرع و ملت ہے

اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟

یہ سیران کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لَے جن کو بھاتی ہے
پرستارانِ خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے

یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے

یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
تو پھر یہ نغمہ توحید و گلبانگ اذاں کب تک

یہ جوش انگیزی طوفانِ بیداد و بلاتا کے
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی

یہ لطف انگریزی ہنگامۂ آہ وفغاں کب تک
چلیں گی تند، بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے

ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
حرم کی سمت بھی صیدافگنوں کی جب نگاہیں ہیں

تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خونچکاں کب تک
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک

یہ مانا گرمیِ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں

دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آوہ فغاں کب تک
کہ لب امن وامانِ شام ونجد و واں کب تک(۳۵)

یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
مولانا کی ملی دردمندی کا ثبوت یہ اور تڑپا دینے والا احساس

سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
واقعہ بھی ہے جب کہ ۱۹۱۲ء کی جنگ میں ڈاکٹر انصاری کو طبی

عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
وفد لیکر ترکی محاذ جنگ پر جاتے ہوئے مولانا نے ان کی قدم

ہمارے ذرہائے خاک ہوں گے زرافشاں کب تک
بوسی کے لئے اپنا سر جھکا دیا تھا اور ان کے آنسوؤں کی لڑی

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی
جاری تھی، واپسی پر ممبئی میں استقبال کرتے ہوئے دوبارہ ان

دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں تک
کے پاؤں کو بوسہ دینا چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے معذرت چاہی

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہم ہیں
اس موقع پر علامہ وقت کا یہ جملہ ''یہ تمہارے پاؤں نہیں اسلام

مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام ونشاں کب تک
کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں'' (۳۶) یہ جملہ جہاں ایک

طرف ان کی حمیت و غیرت اسلامی اور ان کے مذہبی جوش کا غماز ہے وہیں دوسری طرف ان کی ملی تڑپ اور ان کے حساس دل کا ترجمان ہے، اور اسی سے ندوے کے ملی شعور کا بھی تعین ہوتا ہے، مولانا نے اس لڑائی کے زمانے میں اپنی علمی اور عالمانہ بصیرت کے زور سے عیدالاضحیٰ میں قربانی کی رقم کو ترکوں کی مدد کے لئے ارسال کرنے کے جواز کا فتوی مرتب کیا، انہوں نے اس سلسلہ میں فقہ حنفی کی بنیادی کتاب ہدایہ سے مدد لی، (۳۷) اس فتوی پر مولانا عبداللہ ٹونکی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے تایید کی پھر اس کو شایع کیا اور ہزاروں روپیہ جمع کیے۔اس موقع پر بعض حضرات نے مولانا کے اس فتوی پر اعتراض کیا، ان ہی لوگوں میں مولانا ظفر علی خاں بھی تھے، تو مولانا شبلی نے ۱۶/نومبر ۱۹۱۲ کو اپنا جواب بھیجا، جسمیں ان کی علمی بصیرت، نکتہ رسی تو ظاہر ہے ہی، ساتھ ہی ملی مسائل میں ان کی حساسیت کا اندازہ ہوتا اور سے پڑھ کر ان کی طرف نسبت کرنے والوں کو سبق بھی ملتا ہے کہ حق کی نصرت وتایید میں جو بن پڑے وہ کرنا چاہے چہ جائیکہ درہم و دینار کے حرص میں مبتلا ہوکر حق سے چشم پوشی کی جائے اور اعلان حق سے گریز کیا جائے، اور حق بیانی کو مصلحت کوشی کی نیند سلا دیا جائے، مولانا نے جواب میں لکھا:

''عزیزی مولوی ظفر علی خاں صاحب دام قدرہ السلام علیکم میں نے جو فتویٰ لکھا اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط بھی شایع ہو چکا ہے، ہدایہ میں اس کا جزئیہ موجود ہے، البتہ ہدایہ میں صرف جواز ہے اور میں نے افضلیت کا فتوی دیا ہے، اس قدر میرا اجتہاد ہے۔ بھائی! ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو، ہاں وہی سنت مقصود ہے، فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیلؑ پر مقصود تھی، کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے؟ (۳۸)

ان واقعات پر مولانا کی اشک سوئی و دماغ سوزی ہو یا واقعہ کانپور پر مولانا کی پر تاثیر اور طوفان بلا خیز کا اثر رکھنے والی نظمیں ہوں وہ سب اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ملت کے ہر واقعہ سے وہ دلچسپی رکھتے تھے۔

مسجد کی دیوار کے انہدام اور اس پر مسلمانوں کے قتل عام سے مولانا کے حساس دل کو بڑی چوٹ پہنچی، زخمی جذبات موزوں احساسات بن کر اخبارات و رسائل میں چھپے اور اس وقت کی سیاست بلکہ ایک طرح کے سیاسی انقلاب میں بڑا کردار ادا کیا، مولانا نے اس وقت اپنے بمبئی میں ہونے پر بھی افسوس کیا، نونہالان قوم کے قتل پر ماتم بھی کیا اور جذبات و سیاست کو ایک نئی سمت بھی دی، اور یہ ثابت کر دیا کہ قلم و زبان اور علم کی فراوانی کو استحکام و جاودانی محض ملت کے وجود واستحکام اور اس کے لیے تڑپنے سے ہی ملا کرتی ہے، مولانا کا درد ملاحظہ کیجئے:

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خوردسال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر

نیند آ گئی ہے،منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل وشعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں(۳۹)

انہیں اس کا غم تھا کہ وہ اس وقت بمبئی میں کیوں تھے؟

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خون کام آئیں گے
عروس مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہے آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت(۴۰)

ان کے دلی تاثر کا اندازہ ان دو قطعوں سے کیجیے:

اگر چہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگر چہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں
کہ کان پورے کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے
کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم
کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
سن لو وہ گنج ہائے گراں مایہ دفن ہیں
کچھ بیلقاں کہ خاک میں کچھ کان پور میں(۴۱)

مولانا سیاسی نظریہ میں گو آزاد ہوں اور اپنی جداگانہ رائے رکھتے ہوں مگر اسلام کی بالا دستی ہر آن محبوب رکھتے تھے، ان کا حال یہ تھا کہ وہ ایک ایک اخبار کو بغور پڑھتے اور ہفتوں تک اپنی مجلس میں بیان کرتے، خطوط لکھتے تو وفود جوش کا مرقع بن جاتے، ہر کامیابی پر شاداں وفرحاں نظر آتے اور کھل کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے، لیکن اس حقیقت کو ہر آن مقدم رکھتے کہ ان کی ملی تڑپ اسلامی سیاست سے مرتبط ہے، ان کی سیاست کا سرچشمہ اسلام کی تعلیم ہے اور وہ ہر لمحہ اسلام کی بالا دستی کے قائل ہیں، اکابرین ندوہ میں سے ان ہی کو یہ ذوق اور یہ حس قدرت نے عطا کی تھی جس قدر عطا کی تھی۔

آگے چل کر ندوۃ العلماء کے فرزندوں نے اس ملی جذبہ کو اور فروغ دیا، مولانا علی میاں اور شبلی کے درمیان صرف علمی وادبی تاثر ہی نہیں پایا جاتا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ندوے کے ملی، مذہبی اور فکری شعور کو فروغ دینے میں مولانا شبلی کی یہ نظمیں سحر کا سا اثر رکھتی ہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ مولانا علی میاں ان نظموں کو سرسری طور پر پڑھ کر گزر گئے ہوں اور ان کی حساس طبیعت میں ابال نہ آیا ہو، ان کے قلب ارجمند کو ان نظموں نے تڑپایا نہ ہو، مذکورہ بالا سطروں کو نظر میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ مولانا شبلی کے ان تخیلات کو مولانا علی میاں نے کن بلندیوں سے ہمکنار کیا اور ان کے درد کو اپنا درد دل کیسے بنایا، جو مشن انہوں نے چھوڑا تھا اسے دارالمصنفین سے وابستہ رہ کر اور اس سے دور رہ کر کس مقام پر پہنچایا۔

مولانا علی میاں بھی ساری زندگی مسلمانوں کو ان کے ماضی سے جوڑنے کے لئے کوشاں رہے اسلام کے غلبہ واستعلاء کی خواہش ہمیشہ ایک موج بن کر ان کے دل میں جوش مارتی رہی، انہوں نے بڑھ چڑھ کر قومی وملی کاموں میں حصہ لیا، ان کی خصوصیت یہی تھی کہ وہ ہمیشہ قومی ومذہبی مفاد کو مقدم رکھتے تھے، حتی الامکان صلح وامن اور آپسی اتحاد کے لئے کوشاں رہتے

تھے، ان میں علامہ شبلی کی سی جامعیت کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی تھا، ان کے تصنیفی شوق کو کبھی بھی دعوت وتبلیغ کے فریضہ نے رکنے نہ دیا اور نہ اس کے برعکس ہوا کہ ان کی دعوتی زندگی علمی فرائض کی ادائیگی سے متاثر ہوئی ہو، تقریر وتحریر اور دعوتی عمل کے ساتھ کبھی بھی اجتماعی مسائل سے چشم پوشی نہیں کی، عزلت اور گوشۂ عافیت کو کبھی بھی اجتماعیت اور ملی مفادات پر حاوی نہیں ہونے دیا، ضرورت و بساط بھر ملک و ملت کے لیے سیاسی کوششیں بھی کیں، مولانا ہی کے الفاظ میں ''تعمیری سیاست کے ذریعہ ملت کے تحفظ میں حصہ لینا ضروری ہے''، مولانا یہ سب کچھ کیا لیکن ان کے ہر عمل کا سرچشمہ اسلام کی تعلیم ہی رہی اور ہر آن وہ اسی کوشش میں گھلتے اور تگ و دو کرتے رہے کہ مسلمان اپنے ماضی کی روشنی میں اپنا مستقبل تعمیر کریں، مولانا نے اپنے ایک خطاب میں صاف طور پر کہا کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے اور یہ بات ٹھوس استدلال کی بنیاد پر کہی۔

''مذہب اسلام کی پوری تاریخ دعوت وعزیمت سے وابستہ ہے، لیکن اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ بغیر اقتدار کے کام چلتا رہے گا، اس امت کو جو فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر دیا گیا ہے اس میں استعلاء وغلبہ کی ضرورت ہے، اسلئے کہ صیغۂ اُمر ونہی کا استعمال ہی استعلاء کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اگر چہ میرا تعلق فطری طور پر خاندانی طور پر اس مکتب فکر اور اس گروہ سے ہے جو خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات پر وسعت وافلاک میں تکبیر مسلسل کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہے، میری مراد سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اولوالعزم، عالی ہمت رفقاء سے ہے جنہوں نے احیائے خلافت اسلامیہ کی کوشش کی اور ان پچھلی صدیوں میں پورے عالم اسلام میں کسی ایسی جامع مکمل، بلند نظر، بلند ہمت جماعت کا سراغ نہیں لگتا جیسا کہ حضرت سید صاحبؒ کی جماعت تھی، میرا تعلق اس جماعت سے ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے مسلمانوں کو حریت کی فضاء کی ضرورت ہے اور خدا کا یہ فرمان جس طرح نزول کے وقت صحیح تھا، آج بھی صحیح ہے اور قیامت تک صحیح ہوگا۔

الذین ان مکنّٰھم فی الأرض اقاموا الصلوٰۃ واٰتو الزکوٰۃ وامروا با المعروف ونھو اعن المنکر (الحج ۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔

آپ خیال کیجئے کہ معروف ومنکر کے لئے قرآن مجید میں اور حدیث میں امر ونہی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، استدعا و درخواست کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ عربی زبان ایسی تنگ دامن نہیں ہے کہ اس کے اندر صرف امر ونہی کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں، جن میں تواضع ہے، خوشامد ہے، جن میں استدعا ہے، جن میں مطالبہ ہے، بلکہ اس کے لئے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ امر اور نہی کے ہیں۔ تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر، کنتم خیر أمۃ أخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنھون عن المنکر اور امر ونہی طاقت چاہتے ہیں۔ امر ونہی وہ مقام چاہتے ہیں جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ امر میں اور نہی میں

ایک استعلاء ہے۔امر و نہی درخواست کے معنی میں نہیں،امر و نہی حکم دینا اور روکنا،اس کے لئے آدمی کے اندر قوت چاہئے، ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہئے ،ایسا اعتماد چاہئے اور اس کی ایسی وقعت ہو دلوں میں کہ وہ امر کر سکے نہی کر سکے ،اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو قوت کی ضرورت ہے،اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے کہ ہمیشہ وہ یہی نہ کہے کہ ''اگر ایسا کر لیا جاتا تو اچھا تھا'' ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں ''ہم تبلیغ کرتے ہیں''۔اپنی جگہ پر یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن قرآن جو معیار و میزان ہے اس میں الفاظ امر و نہی کے ہیں،جن میں مسلمانوں کو وہ طاقت حاصل کرنی چاہئے کہ جس مقام پر فائز ہو کر وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں ،اس لئے کہ فطرت انسانی تعریف تو کر دیتی ہے اور وہ خوش بھی ہو جاتی ہے لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح ،مکمل اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی جس کے نتیجے میں أقاموا الصلوٰۃ وا توا الزکوٰۃ اور أمر با لمعروف اور نھی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں''۔ (۴۲)

مولانا کی پہلی تصنیفی کاوش میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا، ''سیرت سید احمد شہید'' کے مقاصد تصنیف سپرد قلم کرتے ہوئے جو واضح اور جرأت مندانہ پیغام دیا وہ ان کے اصل خمیر کا غماز ہے:

''نوجوانوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ خود بدلنے کے بجائے زمانے کو بدلنے کی ہمت کریں۔

نازکیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں!

سلطنتوں کو فتح کرنے کا حوصلہ رکھیں کہ نوجوانوں نے یہ بھی کیا ہے،جسم کی آرائش و زیبائش چھوڑ کر بزم جہاں کی آرائش کی فکر کریں اور دیکھیں کہ کیا چیزیں کم ہے کہ پوری کر دیں،کیا رخنے ہیں کہ بھر دیں،کیا چیزیں بے کار ہو گئی ہیں کہ نکال دیں۔

اہل خانقاہ اور مشائخ کو اس کا پیغام ہے کہ:

اے پیرِ حرم، رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا (۴۳)

اس کتاب کے مقدمہ میں علامہ سید سلیمان ندوی نے جن سطروں پر اپنی بات ختم کی ہے وہ سطریں صاف اشارہ کرتی ہیں کہ مولانا نے علامہ کے بنائے ہوئے خاکے میں بڑا خوبصورت رنگ بھرا ہے،اس خطہ میں ایک وقیع باب کا اضافہ کیا ہے،اور قریب کی ہی تاریخ کے ایک روشن باب کو مسلمانوں کے لئے نمونہ عمل کے طور پر لائحہ عمل بنا کر تاریخ نگاری کے ندوی اسلوب میں پیش کر دیا ہے،سید صاحب لکھتے ہیں:

''مصنف نے یہ کتاب بڑے وقت سے لکھی ہے اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں رشد و ہدایت اور عزم و ہمت کا ایک صحیفہ دے دیا ہے، کیا عجب کہ مسلمان اس تاریخی موقع پر اس کتاب سے اصلاح و ہمت کا فائدہ اٹھائیں، اور اپنے ماضی

کے آئینہ میں اپنی مستقبل کی شکل وصورت دیکھیں''۔(۴۴)

یہی نہیں بلکہ مولانا نے علامہ شبلی کی طرح سیر وسوانح اور تاریخ کو اپنا موضوع بنایا۔ اور اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر جو کام کیا وہ علمی، ادبی اور اپنے مقصد کے تئیں خوبصورت کوشش ہونے کے سبب قبولیت کے حدیں پار کر گیا، مولانا کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' ان کے ان ہی جذبات کا بہترین حصہ اور مسلمانوں کے لئے بہترین تحفہ ہے، انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ نہ صرف تاریخ اصلاح وتجدید پیش کی ہے بلکہ علامہ شبلی کے مشن کو عملا آگے بڑھاتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور امت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پر از تغیرات ہے، اس لیے اس کی تاریخ تجدید میں تسلسل ہے، دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیات کی کمی رہی لیکن امت اسلامیہ کو جب کسی زندہ شخص کی ضرورت پیش آئی تو اسے اس زمانے کے مقابلے کے لئے ویسے اشخاص میسر آئے، یہ کتاب دارالمصنفین کے سلسلۂ اشاعت کی ایک کڑی بنی اور اس کے پہلے دونوں حصے یہیں سے نکلے۔

پھر مولانا کی وہ کتاب جو ان کو ہی نہیں بلکہ ندوے کو بھی عجم کی سرحدوں سے باہر عرب ویورپ تک لے گئی، شہرت وناموری کے اس آفتاب کو ''ماخسر العالم بانحطاط المسلمین'' ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کی شکل میں طلوع ہوتے دیکھا گیا، دنیا کی دسیوں زبانوں میں اس کے سینکڑوں ایڈیشن نکلے، یہ کتاب ندوۃ العلماء کے علمی، فکری، مذہبی اور ملی شعور کی عکاس ہے، ایک طرف اگر یہ تاریخ نگاری کا حسین مرقع ہے تو دوسری طرف با مقصد تصنیفی وفکری کاوش کی بہترین مثال، مصنف کے الفاظ میں اس کا مقصد اصلی ملاحظہ کیجئے:

''اگر اس سے کسی ضمیر میں نیا شعور اور کسی دل میں کوئی خلش پیدا ہو جاتی ہے تو مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہے، ہر صالح انقلاب اور نئی تعمیر کے لئے ضمیر کی بیداری اور ذہن کی تیاری ضروری ہے اس کے لئے تاریخ کی با مقصد ترتیب اور ایسی کتابوں اور مباحث کی ضرورت ہے جو ایک طرف علمی اطمینان اور قلبی انشراح پیدا کریں، دوسری طرف پڑھنے والوں میں نیا حوصلہ، نیا یقین اور جوشِ عمل پیدا کر دیں، مبالغہ اور تواضع دونوں سے الگ ہو کر یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے اس سلسلہ کی ایک مفید اور اہم کڑی بن سکتی، اور اس سے اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کے تمام حلقے بلا اختلاف فائدہ اٹھا سکتے ہیں''۔(۴۵)

عہد جدید میں اسلامی فکر کی تشکیل اور نئی نسل کو اسلام سے قریب کرنے نیز ملت میں خود اعتمادی پیدا کرنے والی شخصیات میں ایک بڑا نام سید قطب شہید کا ہے، انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ مولانا کی یہ کتاب عہد جدید میں مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے بہت بہتر وکافی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اسلام کی تعلیم اگر سروری وجہانبانی کی تعلیم ہے تو یہ کتاب خوبصورت انداز میں ماضی کی تاریخ اور مستقبل کا خاکہ پیش کرتی ہے وہ نہ صرف اس کتاب کو دینی واجتماعی تحقیق عمل کا نمونہ قرار دیتے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں یہ کتاب اسلامی زاویۂ نگاہ سے تاریخ کس طرح مرتب کی جائے یہ بھی سکھاتی ہے، ان کی تحریر کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''بلا شبہ اس کتاب میں انسانی زندگی پر اثر ڈالنے والے

تمام عوامل کا ایک مربوط اور منظّم تصور ہے، اسی مربوط و منظّم تصور کے ساتھ تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے، اور امت اسلامیہ کو ایسا مشورہ دیا گیا ہے جس میں پورا اعتدال اور تناسب پایا جاتا ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر یہ کتاب تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوبِ نگارش سے بے نیاز ہوکر (جس میں ارتباط و توازن، مورخانہ انصاف اور علمی تحقیق کی بالعموم کمی ہوتی ہے) تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہیے اور کس انداز سے اس کو مرتب کرنا چاہیے'' (۴۶)

علامہ شبلی نے علم و تحقیق کی جو تبلیغ کی تھی اور تصنیف و تالیف جو کی طرح ڈالی تھی اس کا سلسلہ رکا نہیں بلکہ مولانا علی میاں اس کو برابر بلندی کی طرف لے جاتے رہے، ندوۃ العلماء میں ان کے زمانے میں کئی نئے شعبوں کا قیام عمل میں آیا، علامہ شبلی ایسے ہی اشخاص کی تربیت میں پیش پیش تھے جو حالات کا مقابلہ کرسکیں اور وقت کے چیلنجز کا سنجیدہ علمی جواب دے سکیں، خود انہوں نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات سے اردو کے دامن کو مالا مال کردیا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمانے نے ایک نئی کروٹ لی بلکہ یوں کہا جائے کہ مسلمانوں کے اقتدار سے بے دخلی پر جوں جوں وقت گزرتا رہا اور یورپ کا تہذیبی و سیاسی تسلط بڑھتا رہا، اس کے نتیجہ میں مولانا نے محسوس کیا کہ ایک نیا فکری ارتداد جنم لے رہا ہے، مولانا نے بروقت اس کا ادراک کیا اور اس کو عہد رسالت سے آج تک کی تاریخ میں سب سے بڑا اور خطرناک ارتداد قرار دیا، اس ارتداد کی سنگینی یہ ہے کہ اس کی زد میں آنے والا اور ضروریات دینی اور حقائق دینی کا انکار کرنے والا کسی کلیسا یا مندر میں نہیں جاتا اور نہ تبدیلیٔ مذہب کا خود اعلان کرتا ہے اور نہ اس کا اسلامی معاشرہ اس پر چونکتا ہے اور نہ اس کے ساتھ معاشرہ و معاملہ کرتا ہے جو مرتدین سابقین کے ساتھ کیا جاتا تھا، اس خیال کے سبب مولانا نے ۱۹۵۸-۱۹۵۹ میں ردۃ جدیدۃ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو درحقیقت ڈاکٹر سعید رمضان کے رسالہ المسلمون کا اداریہ تھا، پھر مولانا کو یہ خیال آیا کہ اس مستقل کام کے لئے ایک مستقل اکیڈمی ہونی چاہیے چنانچہ اسی مقصد سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام وجود میں آئی (۴۷) یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ دعوتی مقصد کے ساتھ ساتھ یہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تجویز و تبلیغ کا امتداد ہے جس کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے پہلے خدا کا شکر ادا کیا ہے:

''خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جارہا ہے اور قابل قدر ارباب کرم پیدا ہوتے جاتے ہیں'' (۴۸)

یہاں سے پھر اس لٹریچر کی اشاعت ہوئی جس میں صاف طور پر شبلی کی نظموں کا درد اور ان کی ملی حمیت و غیرت کا رنگ پایا جاتا ہے، انہوں نے یہاں سے ردۃ ولا ابا بکر لها، اور سلسلۂ اسمعیات کو شائع کرکے ان ایوانوں تک پہنچایا جو یورپ کی مادی چکاچوند سے مسحور ہوکر گم کردۂ راہ ہوگئے تھے، یہیں سے انہوں نے مصر و شام کے ہنگاموں پر اپنی مؤثر آواز بلند کی، فلسطین کے المیہ پر اس بیباکی و جرأت مندی کا ثبوت دیا جس نے کم از کم غیرت مند عربوں کے سر شرم سے جھکا دیے، ظالم و جابر حکمرانوں کو تاریخ کی روشنی میں نصیحت

کی، عالم عربی واسلامی میں پائی جانے والی کشمکش کو رفع کرنے کا نسخہ فراہم کیا، ترکی کے ادبار وتخلف کا ماتم کیا، وہاں کی اسلامی الفکر قیادت سے رابطہ کیا، ذہن سازی کی کوششیں کیں، یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ مولانا نے علامہ شبلی سے فکری استفادہ نہیں کیا، ترکی میں تقریر کررہے ہیں، ترکوں کے تئیں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا تذکرہ مقصود ہے تو شبلی کی نظم ''شہر آشوب اسلام'' سے بہتر ترجمانی کون کرسکتا ہے، اس میں سے بھی مولانا نے جس شعر کو خاص طور پر پیش کیا وہ خود تبدیلی کا داعی اور انقلاب کا نقیب ہونے کے ساتھ مولانا کے حسن انتخاب کا مظہر ہے اس موقع پر مولانا نے یہ شعر پڑھتے ہوئے اپنا خطاب جاری رکھا: ؎

زوال دولت عثماں زوال ملک وملت ہے

عزیزو! فکر فرزند وعیال و خانما کب تک (۴۹)

مولانا نے ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے استحکام اور سیاست میں مؤثر کردار کے لئے نہ صرف یہ کہ مسلم مجلس مشاورت کی دعوت وقیام میں حصہ لیا بلکہ اس میں عملا شریک رہے اور اس کے بانی وموسس شمار کیے گئے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اور اس کو انتشار سے بچانے اور ملت کی حفاظت کے جذبہ میں اپنی ایک آنکھ قربان کردی اور اس کا درد زندگی بھر جھیلا، اس وقت وت وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوگئے لیکن پھر مجلس کی ناکامی اور اس کے بکھراؤ نے جو درد دیا اس کو وہ کیا پوری ملت ہندیہ اب بھی جھیل رہی ہے، مولانا نے ملت اسلامیہ ہندیہ کے تمام مسائل میں دلچسپی لی اور حتی المقدور اپنی کوششوں سے نفع پہنچانے کی کوشش کی فسادات کی آگ ان کے دل کو جھلساتی تھی، مسلمانوں کا خون انہیں بھی خون کے آنسو رلاتا تھا، خود اپنوں کی ناعافیت اندیشی انہیں کمزور کردیتی تھی لیکن وہ ہر آن سرگرم عمل رہتے اور سراپا عازم سفر رہتے، ہر لمحہ کو استعمال کرنے کی دھن تھی اور ہر شخص کو کام میں لگادینے کا جذبہ تھا۔

قومیت اور دیگر چیلنجز کا مقابلہ

ہمیں عہد جدید کے معلم اول علامہ شبلی کی تحریروں اور خطبات میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ''قومی ترقی'' کی ترکیب میں ''قوم'' کے بجائے ''مذہب'' کا لفظ استعمال کرنے کے داعی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''قومی ترقی ایک جملہ ہے جس کے دو جزو ہیں، قوم اور ترقی اور چوں کہ مسلمانوں کی قومیت صرف مذہب ہے اس لیے درحقیقت قوم کے بہ جائے مذہب کا لفظ استعمال کرنا صحیح ہے، اس بنا پر قومی ترقی اس وقت ہوسکتی ہے، جب ترقی کے ساتھ مذہب بھی قائم رہے، ورنہ اگر مذہبی حالات درست نہ رہے تو ترقی کسی اور قوم کی ترقی ہوگی، مسلمانوں کی نہ ہوگی'' (۵۰)

مولانا شبلیؒ نے یہ ایک خیال اپنی ایک گفتگو کے ضمن میں پیش کیا اور دارالعلوم کے اجلاس میں پیش کیا لیکن دنیا نے دیکھا کہ جب قومیت عربیہ کا بت تراشا گیا تو اسی دارالعلوم کے اصحاب قلم نے کس طرح اسی طوفان کا مقابلہ کیا اور قومیت کے علمبردار ایوانوں کو متزلزل کردیا، ندوۃ العلماء کی صحافت کا رخ قومیت عربیہ کی طرف موڑ دیا گیا اور یہ باور کرکے سکون کا سانس لیا گیا کہ قومیت صرف اسلام ہوسکتی ہے اس کے علاوہ دوسری قومیت کا تصور ممکن ہی نہیں۔

اسلامی تہذیب وتمدن پر جب نہایت سنجیدگی کے ساتھ

جرجی زیدان نے حملہ کیا اور تاریخ التمدن الاسلامی لکھ کر اس نے اسلامی تاریخ کو داغدار کرنے کی کوشش کی، بھولے بھالے لوگ اس کی ریشہ دوانیوں اور چیرہ دستیوں کو سمجھنے سے بھی قاصر رہے اور جو سمجھے وہ حالات کے سبب جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھے، اس موقع پر علامہ شبلی کا ہی قلم تھا جس نے محاذ سنبھالا اور الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی کے ذریعہ جرجی زیدان کی خیانتوں کو واضح کیا، اس تنقید پر خود سید رشید رضا نے مولانا کا شکریہ ادا کیا اور یہ اعتراف کیا کہ مولانا شبلی نے امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

مولانا کی اس تنقیدی روایت کو مولانا علی میاں نے قائم و جاری رکھا، جب اس طرح کے فکری حملے ہوئے تو ان کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا نے اپنی سی کوششیں کیں، ان کو اس طرح کا بھی تجربہ ہوا کہ جب وہ عالم عربی کے واقعات پر نقد کر رہے تھے اور ملت کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کر رہے تھے تو روایت پسند اور مفادات کی قید میں رہنے والے تنگ نظر لوگ مولانا کی تنقید کر رہے تھے، جیسے مولانا شبلی ایک صدی بعد کا دور دیکھ کر رائے دے رہے تھے اور دوسرے بعض لوگ اس اس وقت کی صورت حال میں محصور تھے، چنانچہ ایک موقع پر مولانا کو بڑے جرأتمندانہ لہجہ میں کہنا پڑا، اور لہجہ میں شبلی کا لہجہ جھلک گیا، انہوں نے لکھا:

''ہمارے ملک کے بہت سے علماء کی سطحی قسم کی سیاسی دلچسپیاں ترکی کے پچھلے دور کے علماء کی طرح اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ان کو فکر و مطالعہ اور روز مرہ کے واقعات و حقائق کیساتھ اپنے کو ہم آہنگ رکھنے کا موقع نہیں ملتا، اس کا نتیجہ ہے کہ ان کو بہت سے انقلابات کی اس وقت خبر ہوتی ہے، جب وہ اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ جاتے ہیں، اور ان کے فکری نتائج ظاہر ہونے لگتے ہیں، یہی معاملہ ترکی کے انقلاب کے موقع پر پیش آیا کہ ہمارے علماء عرصہ تک (اور شاید بعض اب بھی) کمال اتاترک کو اسلام کا بطل اعظم اور مجدد سمجھتے رہے(۱)، اور ان کو اس کے دور رس اقدامات اور ترکی کو مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششوں کا علم اس وقت ہوا جب وہ اپنی آخری شکل کو پہونچ گئیں اور اس کا خطرہ محسوس ہونے لگا کہ ترکی کا رشتہ عالمگیر اسلامی برادری، یہاں تک کہ اپنے ماضی اور قدیم ثقافت سے بالکل منقطع ہو جائے گا''۔(۵۱)

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر جب ضرورت پڑی تو تنگ نظر لوگوں کو مولانا نے اس بلندی سے خطاب کیا جو شبلی کے اسلوب میں جا بجا نظر آتی ہے، گویا شبلی نے ندوے کو فکری و علمی لحاظ سے جس بلندی پر پہنچنے کا تصور پیش کیا تھا اس کے بعض فرزند اس تصور کی تصویر بننے میں کامیاب رہے، یہاں مولانا کا یہ انداز بیان دیکھیے جو ان لوگوں کا جواب ہے جو کہ قومیت کے غلط فکر پر تنقید کرنے کے سبب یہ بے جا اعتراض بلکہ طنز کر رہے تھے کہ ہندوستان میں بیٹھ کر عرب دنیا کی فکر اور اس کے زعماء پر تنقید کیوں کی جائے مولانا نے لکھا:

''میرے تخیلات کی دنیا میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائرِ روح کا حقیقی نشیمن، عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان و ادب اور اس کی تہذیب و ثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر (جس کی حفاظت اور سربلندی کے لئے قومیت عربیہ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے) میرا حق کسی طہٰ حسین،

کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں'' (۵۲)

فتنوں کے ادراک اور اس پر تڑپنا جس طرح حیات شبلی کا ایک موثر و روشن باب ہے اسی طرح مولانا کے یہاں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا کا یہ رنگ دیکھیے جس میں شبلی کے زور خطابت کے ساتھ علمی سنجیدگی بلند آہنگی، فتنوں کا ادراک اور عمل کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، اس اقتباس میں شبلی کے وہ جذبات بھی نظر آئیں گے جن کی طرف علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں توجہ کرنے سے ان کے قلم کا رخ ابتدائی فقہی مباحث سے یکسر نظر پھیر کر مستشرقین کی تردید اور ہیروز آف اسلام کے سلسلہ کی تدوین اور مسلمانوں کو ان کے ماضی سے جوڑنے کی دھن میں یکسو ہو گیا، مولانا کہتے ہیں:

''آج رسول اللہ ﷺ کے سرمایہ پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے، آپ کے قلعہ میں شگاف پیدا کئے جا رہے ہیں، آپ کے دارالسلطنت پر حملہ کیا جا رہا ہے، اگر آج امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالک، امام احمد بن حنبلؒ ہوتے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ شاید وہ فقہ کی تدوین بھی تھوڑی دیر کے لئے روک دیتے اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کرتے، تم خوش قسمت ہو کہ فقہ حنفی، فقہ شافعیؒ کی تدوین کی خدمت تمہارے ذمہ نہیں ہے، اللہ کی حکمتِ بالغہ اور اس کی قدرت کاملہ نے اس کے لیے پہلے ہی انتظام کر دیا، اور امت کو امام شافعیؒ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام احمدؒ جیسے ائمہ عطا کئے، جب کہ ایک لمحہ اور ایک منٹ کی تاخیر کی گنجائش نہیں تھی، تم خوش قسمت ہو، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، آج تمہارے لئے کام کے دوسرے میدان ہیں، آج تمہارے لئے الحاد سے پنجہ آزمائی کا موقعہ ہے۔

تمہارے لئے الحاد اور مادیت سے آنکھ ملانے کا موقع ہے، یقین مانو کہ اس سے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ و امام احمدؒ کی روح نہیں، محمد عربی ﷺ کی روح خوش ہوگی، آج کب سے یہ صدائیں لگ رہی ہیں کہ ؎

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بہ میداں درنمی آید سواراں راچہ شد'' (۵۳)

مولانا کے اسی جذبہ اور فکر کا نتیجہ تھا کہ جب ادب کے راستہ سے الحاد و باطل نظریات کو فروغ دیا جانے لگا تو مولانا نے نہ صرف تنقید کی بلکہ پرزور تحریک چلائی اور ساری دنیا میں ادباء اسلامیین کا ایک رابطہ قائم کر دیا، جس نے نہ صرف یہ کہ اسلامی فکر سے مالا مال تحریروں کا وزن و معیار قائم کیا بلکہ اس راہ سے مغربی تہذیب و تمدن کی جو جلوہ سامانیاں پیش کی جا رہی تھیں اور نئی نسل کو گمراہ کیا جا رہا تھا اس کے مقابلہ میں اسلامی تاریخ، اسلامی تمدن و تہذیب اور رجال تاریخ کے اسلامی کردار کو پیش کر کے اس فکری یلغار کا مقابلہ کیا، خود مولانا علی میاں نے اپنے متعدد فکری رسائل کے ذریعہ عالم عربی میں اٹھنے والے فکری کشمکش کے طوفان کا مقابلہ کیا اور مغرب کی طرف سے تشکیک کا جو رجحان پیدا کیا جا رہا ہے اس کی بھرپور مدافعت کی۔

تحفظ اسلام اور مکاتب کے قیام کی فکر:

مولانا شبلی کی دینی غیرت کا اندازہ ان جملوں سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۱۲ء میں ''تحفظ اسلام'' کے عنوان سے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمائے تھے، دراصل ان کو شاہ جہاں پور سے ایک خط موصول

ہوا تھا کہ شہر سے ۸ کوس کی دوری پر ایک گاؤں میں کچھ راجپوت مسلمان ہندو ہونا چاہتے تھے، انہوں نے مولانا شبلی کو لکھا تھا کہ آپ جلد آیئے اور مدد کیجئے مولانا فرماتے ہیں:

''.....جس وقت میں یہاں سے چلا ہوں میری جو حالت تھی نہایت سخت، یہ طلبہ ندوہ کے جو یہاں بیٹھے ہیں وہ اس کے شاہد ہوں گے کہ میں نے اس وقت کوئی گالی، کوئی سب وشتم نہیں اٹھا رکھی تھی، جو میں نے ان ندوہ والوں کو نہ سنائی ہوگی کہ اے بے حیاؤ اور اے کم بختو! ڈوب مرو یہ واقعات پیش آئے ہیں، ندوہ کو آگ لگادو اور علی گڑھ کو بھی پھونک دو، یہی الفاظ میں نے اس وقت کہے تھے جو آج کہتا ہوں، اس وقت نہایت افسوس میں میں یہاں سے گیا تھا.....'' (۵۴)

مولانا شبلی پر اس واقعہ ارتداد کا بڑا اثر ہوا، اور کیوں نہ ہوتا وہ ایک عالم دین تھے، باغیرت عالم دین جن کا قلم ایک طرف غلبہ اسلام کا خواہاں تھا اور مسلمانوں کو ان کے عروج کی داستان سنا رہا تھا تو دوسری طرف ان کی آنکھیں اس نازک وخطرناک صورت حال کا مشاہدہ کر رہی تھیں جس میں خود مسلمان ہندو ہو رہے تھے، مولانا سے رہا نہ گیا، انہوں نے باقاعدہ اشاعت اسلام، مدافعت اسلام اور تحفظ اسلام کو اپنے خطوط کا موضوع بنایا، مضامین وتجاویز اخبارات میں شائع کیں، تقریر میں صورت حال کا مؤثر تذکرہ کیا، بعض علاقوں کے خود دورے کیے اور جا کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ مولانا کی یہ حمیت وتڑپ نہ صرف تحریک ندوۃ العلماء کا مقصد قرار پائی بلکہ ان کی گرم نفسی نے حصول مقصد کے لئے تحریک میں جوش بھر دیا، اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے مولانا نے دو تجاویز رکھیں:

''اب صرف دو تدبیریں نظر آتی ہیں ایک یہ کہ ایسے دیہات میں نومسلموں کے لیے، مسلمانوں کے لیے چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کیے جائیں ۵-۶-۷ گاؤں کا ایک حلقہ قرار دے کر ایک صدر مقام ہو جہاں سے آدھ آدھ کوس کے فاصلے پر دیہات ہوں، وہاں ایک مکتب ہو، جس میں نہ آپ کا یہ فلسفہ یونانی اور نہ انگریزی کا ایک لفظ ہو، بلک صرف قرآن شریف کا متن اور اردو اتنی کہ جس سے محض مسائلِ عبادت نماز، روزہ اور وہ بھی نہایت آسان آسان، مشکل اور دشوار مسائل فقہ بھی نہیں، یہ ان کو پڑھائے جائیں بلکہ زور کے ساتھ اس بات کو کہتا ہوں، چاہے حامیان اردو بگڑیں یا بنیں، مگر ہم کو ناگری میں ان رسالوں کو شائع کرنا چاہیے، یا تو اس قسم کے مکاتب جابہ جا قائم کیے جائیں یا دوسری یہ تدبیر ہے کہ ایسے لوگ جو بڑے عالم نہ ہوں جو فارغ ا نہ ہوں، جو بہت جید طالب علم نہ ہوں، اس واسطے کہ اگر ایسے ہوں گے تو پانچ دس روپیہ میں وہ آپ کا کام نہیں کر سکتے، ان کی شان کے بھی خلاف ہے بلکہ ایسے معمولی خواندہ آدمی ہوں کہ جو اردو فارسی معمولی پڑھ لیتے ہوں، ان کو ٹریننگ کے طور پر ندوہ میں یا مدرسۂ الہیات کانپور میں سال بھر مزید تعلیم، وظیفے دے کر دلائی جائے، اس کے بعد دس دس بارہ بارہ روپیہ تنخواہیں مقرر کر کے ان کو دیہات میں بھیجا جائے کہ دو دو تین تین مہینے قیام کریں اور وعظ کہیں اور سمجھائیں، مل جل کر نصیحت کریں اور زبانی باتوں میں تعلیم دیں جب ایک گاؤں درست ہو جائے گا تو دوسرے گاؤں پر اثر ہوگا''۔ (۵۵)

مولانا شبلی کے اس فکر کو مولانا علی میاں سے زیادہ شاید کسی

نے فروغ نہ دیا، انہوں نے دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے ایک طرف اسکولوں میں مسلم طلبہ کے عقائد کی فکر کی تو دوسری طرف مکاتب کا جال بچھانے کی پر زور دعوت دی، مسلمانوں کو بار بار مخاطب کر کے کہا کہ ہر محلّہ اور ہر گاؤں میں بنیادی دینی تعلیم کا مکتب قائم ہونا چاہیے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مولانا نے فرمایا کہ ہر مسجد میں یہ مکتب قائم کردو اس لیے کہ انقلاب زمانہ کا اثر سب سے آخر میں جس مقام تک پہنچے گا وہ یہی مساجد ہیں (۵۶)، مولانا کی کوششوں سے ہندوستان بھر میں مختلف شہروں، قصبات اور گاؤں میں ندوۃ العلماء کی شاخیں اور مکاتب قائم ہوئے، اور ان مکاتب کا شمار ہی ممکن نہیں جو محض اس فکر کے تحت بغیر ندوے کی نسبت کے اپنی بنیادی خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ایسے بھی بعض خیر اندیش نظر آتے ہیں جو شبلی شناسی کے دعوے کرتے ہیں مگر ندوے کے ذریعہ مکاتب و مدارس کے اس جال کو ندوے کا زوال قرار دیتے ہیں، ہر فکر و اقدام کے کچھ منفی اثرات ہوا کرتے ہیں لیکن ان کے خوف سے مثبت نافع کو ترک نہیں کیا جا سکتا البتہ ان اثرات کو زائل کرنے کا کام کیا جا سکتا ہے، اگر ملحقہ مدارس و مکاتب کی بڑھتی تعداد سے ندوے کے علمی و تعلیمی معیار پر اثر پڑا ہے تو اس کے تدارک کی کوشش ہونی چاہیے اور مدارس کے قیام کو با مقصد بنانا چاہیے نہ کہ اس کی منفعت کا انکار کرنا چاہیے۔

مولانا ہی کے زمانے میں شعبۂ دعوت و ارشاد اور شعبۂ اصلاح معاشرہ سرگرم عمل ہوا، ندوے کی طرف سے گاؤں گاؤں میں اصلاحی تبلیغی جلسے منعقد کیے گئے، زمینی سطح پر ندوے نے کام کیا اور عوام سے اس کا ربط قائم ہوا، مولانا کے زمانے میں ندوۃ العلماء نے باقاعدہ تحفظ ختم نبوت کی تحریک میں مؤثر حصہ لیا جبکہ اس موضوع کو ضمنی طور پر تحریک کے مقاصد میں پہلے ہی شامل کر لیا گیا تھا، اس موضوع پر ندوے کے ایک اجلاس میں علامہ شبلی کی ایک تقریر یادگار اور قیمتی قرار دی گئی ہے، (۵۷)، ندوۃ العلماء میں ''عالمی کانفرنس تحفظ ختم نبوت'' بڑے جوش و خروش اور پر شکوہ انداز میں منعقد ہوئی (۵۸)، مولانا نے قادیانیت کی تردید میں خالص سنجیدہ علمی اسلوب میں نہایت مؤثر کتاب لکھی جس کی افادیت و تاثیر کو عالمی پیمانہ پر قادیانیت کے رد میں منظر عام پر آنے والے لٹریچر کے مابین تسلیم کیا گیا، وجہ اس کی وہ اسلوب تھا جو شبلی و ندوی قلم اعجاز رقم کی میراث تھا، مولانا نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب کے لئے شبلی و سلیمان کے ندوی قلم کی ضرورت تھی۔

مولانا علی میاں نے برادران وطن میں اسلامی تعلیمات کے تعارف کے لئے حکمت عملی کا سہارا لے کر تحریک پیام انسانیت چلائی اور پھر اس کے ذریعہ ان تک خاص اسلامی لٹریچر ہندی و انگریزی زبان میں پہنچایا گیا، اس تحریک کی مقبولیت ہوئی، غیروں سے قریب ہونے کا موقع ملا تو رفتہ رفتہ یہ تحریک تبلیغ اسلام کا ذریعہ بن گئی اور بے شمار لوگ اس کے ذریعہ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے، اسی تحریک کو با اثر اور مقصد کو حاصل کرنے کیلئے اس روایت کی ابتدا ہوئی جو علامہ شبلی کی منشاء تھی کہ متعدد فضلاء کو انگریزی، سنسکرت اور ہندی سیکھنے کے لئے متعدد مقامات پر بھیجا گیا، اور بالخصوص ہندو دھرم کی کتابوں کا مطالعہ کرایا گیا۔

مولانا شبلی نے اپنی تجویز میں اشاعت اسلام کے لئے جو

دوسری تجویز رکھی ہے اس کو ہم تبلیغی جماعت کے وجود میں آنے سے قبل اس طرح کی کوشش کا اولین تصور کہہ سکتے ہیں، مولانا علی میاں نے تبلیغی جماعت کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے نہ صرف ہندوستان میں اس کے ساتھ دورے کیے بلکہ اپنے زبان وقلم اور عملی اقدامات کے ذریعہ اسے بیرون ہند بھی متعارف کرایا، بیشک اس جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلوی صاحب ہیں، جن سے مولانا علی میاں کا ارادت مندانہ تعلق تھا لیکن سچ یہ ہے کہ کام کی افادیت کے پیش نظر انہوں نے اس کی اشاعت میں حصہ لیا، اگر ان کے اس کام کو بھی شبلی کے خواب کی تعبیر قرار دیا جائے حرج کیا ہے، کیوں کہ ملی شعور کے تحت ہی تو شبلی پہلے علی گڑھ پھر ندوہ پھر دارالمصنفین و مدرسۃ الاصلاح کے لئے کوشاں رہے، اسباب جو بھی رہے ہوں لیکن ہر جگہ ملت کی تعلیم وترقی پیش نظر رہی، مولانا نے بھی جب جہاں اسلام اور امت اسلام کی بھلائی دیکھی تو وہیں کے ہوکر رہ گئے، اس کی بہترین مثال ان کا مولانا مودودی اور مولانا محمد الیاس سے تعلق اور پھر اپنی علمی ودعوتی کوششیں ہیں۔

۱۲ شوال ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز پیش ہوئی ممالک غیر میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے منتخب انگریزی داں طلبہ کو وظائف دے کر عربی زبان اور دینیات کی تعلیم دی جائے اور ندوہ ان کو تبلیغ ودعوت کے لئے بیرون ممالک روانہ کرے اس موقع پر مولانا شبلی نے یہ تجویز پیش کی ''ایک فارغ ا طالب علم تکمیل کے لئے مصر بھیجا جائے، دونوں ہی تجویزیں جلسۂ عام میں غور وخوض کے لئے ملتوی ہوگئیں۔'' (۵۹)

گوکہ ان دونوں تجاویز پر خاطر خواہ اور منظم عمل مولانا کے عہد نظامت میں بھی نہ ہوسکا، لیکن تکمیل کے لئے بڑی تعداد میں طلبہ کی مصر وشام، سعودی عرب اور یمن اور دیگر ممالک میں داخلے کی روایت شروع ہوئی، ان میں سے متعدد حضرات بڑے باکمال ہوئے اور اپنے اپنے حلقوں میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا اور مختلف علمی کام انجام دیے، ممالک غیر میں دینی، دعوتی، علمی وتعلیمی خدمات انجام دینے والے فضلاء ندوہ کی خدمت خود ایک کتاب کا موضوع ہے، خود ندوے کے اس مایہ ناز فرزند نے انگریزی بھی پڑھی اور عرب اساتذہ سے استفادہ بھی کیا اور قانوناً نہ صحیح مگر عملاً مذکورہ بالا دونوں تجاویز کو اپنی ذات سے شرمندۂ تعبیر کیا۔

مولانا شبلی نے اپنے ایک مضمون ''ندوۃ العلماء کیا کر رہا ہے'' میں نہایت فاخرانہ لہجہ میں انگریزی کے داخل نصاب کرنے اور اس کے نتیجہ میں ایک انگریزی خواں پنجابی مسلم اور ایک افریقی نومسلم کے ندوے میں داخل ہونے کا ذکر کیا ہے، اور دونوں کی غرض تعلیم یہ لکھی ہے کہ ان سے آئندہ اشاعت اسلام کا کام لیا جاسکے گا، (۶۰)

مولانا علی میاں نے علامہ شبلی کے اس فاخرانہ لہجہ کو دوام و استحکام میں تبدیل کر دیا، دارالعلوم میں خصوصی درجات کھولے گئے، اسکولوں سے بے شمار طلبہ آنے لگے اور عالمیت کی سند لے کر معاشرے میں اصلاح واشاعت اسلام کے بڑے کام انجام دیے، افریقہ وانڈونیشیا اور ملیشیا، تھائی لینڈ نیز بعض دیگر ممالک کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد کا توارد مولانا ہی کے زمانے میں شروع ہوا اور مجھے یہ عرض کرنے دیجئے کہ ندوے کا فکر ترکی سے

انڈونیشیا تک مولانا ہی کے زمانے میں اس طرح پہنچا کہ مذکورہ ممالک میں جا کر اجنبیت نہ محسوس ہو، سال گزشتہ مجھے یہ معلوم کر کے بے پناہ خوشی ہوئی کہ ترکی کے ایک ندوی فاضل جو تین سال مولانا کی تربیت میں رہے انہوں نے علامہ شبلی و مولانا علی میاں کی تقریباً ۲۵ کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کیا (۶۱)، بلا جھجک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان خصوصی درجات کے نظام میں گو اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر ان کی افادیت سے انکار نہیں، ایک طرف اگر ان سے علامہ شبلی کے فکر کو تعبیر ملی تو دوسری طرف مختلف ممالک میں اشاعت اسلام کا کام انجام پایا۔

اصلاح نصاب

ان سطروں میں نصاب تعلیم اور اس کی اہمیت و تاریخ نیز اس کی اصلاح پر بحث مقصد نہیں، عرض صرف یہ کرنا ہے کہ بانیان ندوہ میں جو شخصیت سب سے زیادہ اصلاح نصاب کے لئے کوشاں تھی وہ علامہ شبلی کی دور اندیش شخصیت تھی ان کو اپنی رائے پر اصرار تھا اور وہ اپنا مجوزہ نصاب ہی مفید سمجھتے تھے اور اسی کا نفاذ چاہتے تھے، کیوں کہ ان کی نظر ایک صدی بعد پیدا ہونے حالات پر تھی، اس وقت وہ جن خطرات کا مقابلہ کر رہے تھے ان کا احساس یہ تھا کہ آئندہ یہ خطرے زیادہ مہیب صورت میں سامنے آئیں گے، گو کہ تحریک کا مقصد اولین ہی اصلاح نصاب تھا مگر ارکان کے اختلاف نظر کے سبب اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی تھی، علامہ شبلی کے دور معتمدی میں ان کی جہاں بینی، قدیم و جدید سے واقفیت اور وسیع مطالعہ کے سبب اس میں مناسب و مؤثر تبدیلیاں عمل میں آئیں، اعلیٰ تعلیم اور تکمیل کا درجہ کھولا گیا قرآن کریم کے درس کو خاص طور پر جگہ دی گئی، انگریزی تعلیم کا نظم کیا گیا، گو کہ اس کی ابتدا میں مخالفت ہوئی، ہندی اور سنسکرت کا درجہ قائم ہوا، کیا خوب ہوتا کہ یہ بہ تسلسل جاری رہتا، عربی کے نئے نصاب کا اجراء ہوا، درسیات میں حذف و اضافہ کا عمل ہوا، طلبہ میں تقریر و تحریر کی مشق پر علامہ نے خاص توجہ دی اور لائق مدرسین کی فراہمی میں بھی کسر نہ چھوڑی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا علی میاں نے حتی الامکان علامہ شبلی کی اصلاحات کو مزید مؤثر بنایا، انگریزی کی تعلیم کا بہتر نظم جو کر سکتے تھے کیا بلکہ خود جس وجہ سے صحیح اتنی انگریزی پڑھی کہ مغربی مصادر سے ان کے لیے استفادہ ممکن ہوا، ثانویہ سے عالیہ درجات تک ہر درجہ میں انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار پائی اگر چہ اس کی تدریس و تعلیم پر وہ توجہ پھر بھی نہ ہو سکی جس کی ضرورت تھی اور جو اس زبان کا اس عہد میں حق ہے، انگریزی کی صورت حال آج بھی بہر حال قابل غور ہے، مولانا نے قرآن کو اپنا محبوب ترین موضوع بنایا، مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی طلبہ کو بتائے، تخصص فی التفسیر معیاری بنانے کی بھر پور کوشش کی، طلبہ میں ذوق پیدا کرنے کے لئے جہاں جہاں سے لوگوں کو کھینچ کر لا سکتے تھے لائے اور علامہ شبلی کی اس روایت کو پورے آب و تاب سے زندہ رکھا جو انہوں نے سید رشید رضا کو ۱۹۱۲ کے اجلاس ندوۃ العلماء میں مدعو کر کے ڈالی تھی، عالیہ درجات میں قرآن کو تقسیم کر کے اس کی بلا واسطہ تفسیر کا اہتمام کیا گیا، اصول تفسیر کی کتابیں داخل درس کی گئیں، خود مولانا نے جدید نصاب کے لئے بڑی عرق ریزی کر کے عربی کی ریڈریں تیار کیں اور ایسی تیار کیں کہ ان کو عربوں نے بھی سب سے لائق انتخاب قرار دیا، مختلف ندوی فضلاء سے صرف و

نحو وغیرہ کی ابتدائی کتابیں لکھوائیں۔

مولانا نے بڑی حد تک شبلی کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی، وہ مطالعہ کے تنوع، نئی تحریکات، نئے رجحانات سے پختہ واقفیت حاصل کرنے کے داعی تھے اور نصاب تعلیم کو تغیر پذیر سمجھتے تھے، البتہ صرف نصاب تعلیم کی تبدیلی کو مکمل کلیہ نجات نہیں تسلیم کرتے تھے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ مولانا جس فکر کے حامل تھے اس کو شاید مخالفتوں کے خوف یا جانے کن اسباب کی بنا پر عملی رنگ نہ دے سکے، مولانا کو اس کا ادراک تھا کہ جو لوگ زمام اقتدار اور نظام دنیا سنبھالتے ہیں وہ مذہب بیزار اور دینی تعلیم سے بے بہرہ و ناآشنا ہوتے ہیں اور جن کو دینی علوم میں دسترس حاصل ہوتی ہے اور علوم اسلامیہ کے ماہر ہوتے ہیں ان کے ہاتھ نظام نہیں آتا، معاشرے میں پائی جانے والی فکری و عملی کشمکش کا یہی سب سے بڑا سبب ہے، مولانا غالباً ہندوستان میں پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے علم میں ثنویت اور دوئی کے تصور کا انکار کیا اور مدرسہ کی تعریف کچھ یوں کی ''وہ نبوت کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے کشت زاروں میں ڈالتا ہے''، بلا شبہ انہوں نے ندوے کے نصاب میں بڑی اصلاحات اور تبدیلیاں کیں لیکن ان کے ان ادراکات و تصورات کے سبب نصاب تعلیم میں مزید جس تبدیلی کی امید کی جاسکتی ہے اس کا امکان اب بھی باقی ہے۔

خلاصۂ کلام:

مذکورہ بالا سطور سے ہرگز یہ ثابت کرنا مقصد نہیں کہ مولانا علی میاں صرف اور صرف علامہ شبلی سے متأثر ہیں اور ان کی شخصیت پر صرف ان ہی کا پرتو نظر آتا ہے اس میں شک نہیں کہ انہوں نے شبلی سے استفادہ کیا لیکن اور بہت سی شخصیات ہیں جو ان کے ذوق وفکر کی تشکیل میں مؤثر ثابت ہوئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت ہشت پہل اور مقبول عام وخاص رہی ہے، اگر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی بھی جائے کہ ان کی فکری وعلمی مقبولیت کی وجہ صرف شبلی کے فکر واسلوب سے استفادہ ہے، تو ایسا کرنے سے شبلی کی عظمت میں کوئی مزید اضافہ بھی نہ ہوگا، شبلی شبلی تھے، وہ عظیم تھے اور عظیم ہیں، وہ یکتائے زمن اور علوم اسلامیہ کا مخزن تھے، وہ شمس العلماء تھے، تاریخ وسیرت اور شعر و ادب کے سانچہ میں ان کی شخصیت ڈھلی تھی، بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ شبلی نے جو چراغ روشن کیا وہ اب تک جل رہا ہے اور اس کی روشنی سے زمانہ منور ہے، مولانا علی میاں بھی اسی سلسلہ کی ایک مضبوط وخوبصورت کڑی ہیں، بقول خود انہوں نے شبلی کی تصنیفات کو ابتدا میں ہی پڑھ لیا تھا اور ابتدائی مطالعہ نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے، پھر ان کو اس شخصیت سے شرف تلمذ حاصل ہوا جو شبلی کی ساری علمی وفکری تمناؤں کا مجسم پیکر تھی، مولانا علی میاں نے تاحیات حقائق کے اعتراف کی روش قائم رکھی، شبلی نے ندوے میں بیٹھ کر جس طرح علم وتحقیق اشاعت اسلام، عالم اسلام سے تعلقات، غلبۂ اسلام کی فکر، اور متعدد قومی ومذہبی کام انجام دیے تھے علی میاں نے نہ صرف ان کو جاری رکھا بلکہ ان کے بہت سے خاکوں میں رنگ بھر کر پایہ تکمیل تک پہنچایا، انہوں نے علامہ شبلی کی طرح مختلف قومی تحریکوں میں حصہ لیا، ملی مسائل میں دلچسپی لی، ہندوستان میں اتحاد اسلامی کی علامت بن گئے، بڑی حد تک علماء کو متحد رکھنے میں کامیاب ہوئے، مسلم پرسنل لا

کے پلیٹ فارم سے شیعہ سنی اتحاد کو بھی کسی حد تک باقی رکھا، مسلمانوں کے عائلی مسائل کے لئے پرزور تحریک چلائی:۱۹۱۳ء میں جس مدینہ یونیورسٹی کی تجویز مختلف حلقوں سے آئی تھی اور اس میں ماہرین تعلیم و تدریس کی فراہمی کی فہرست میں ہندوستان سے علامہ شبلی اور مولانا فراہی کا نام پیش ہوا تھا مولانا اس کے تاسیسی رکن رہے اور پھر وہاں وقتاً فوقتاً ان کے محاضرات کا تاحیات سلسلہ چلتا رہا۔

یہ سب وہ کام ہیں جن کا نقش اول حیات شبلی میں موجود ہے، اگر اعلیٰ ظرفی اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ یہی سامنے آئے گا کہ علی میاں فکر شبلی کے ترجمان اور ان کے فن کے نگہبان تھے، ان کی بیشتر تحریریں شبلی کی نظم شہر آشوب اسلام کا مفصل بیان ہیں، ان کے ادبی ذوق میں شبلی کا عکس، تنقیدی بصیرت میں شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کا شعور واور ملی دردمندی میں شبلی کا سوز موجود ہے وہ قومی و ملی کاموں میں شبلی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے پیش پیش نظر آتے ہیں، وہ خامۂ شبلی کے شیدائی، ان کے اسلوب کے گرویدہ اور ان کی عظمت کے معترف ہیں۔

حوالہ جات:

(۱) تاریخ ندوۃ العلماء ج ا ص ۱۰۸، طبع ۲۰۰۸، مجلس صحافت ونشریات، لکھنو،

اسکی عبارت یوں تھی: ''اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جلسۂ ندوۃ العلماء جو بمقام کانپور منعقد ہوا تھا، اور جس میں علماء اور اکابرِ دین جمع ہوئے تھے، تمام مسلمانوں کی توجہ کے لائق ہے، اور اس کے مقاصد یعنی اصلاح طریقۂ تعلیم اور رفع نزاع باہمی نہایت عمدہ اور مفید ہیں، تمام مسلمانوں کو ایسی عمدہ اور مفید مجلس کی جس سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی بہبود متصود ہے، بہ دل و جان قلم سے، قدم سے، درم سے مدد کرنی چاہئے''۔ (تاریخ ندوۃ العلماء ج ا ص ۱۰۸)

(۲) کاروان زندگی ج ۳ ص ۲۳۲، طبع ثالث ۲۰۰۱، مکتبہ اسلام، لکھنو

(۳) علامہ شبلی نعمانی معنویت کی بازیافت ص ۱۲۵، سنہ اشاعت ۲۰۰۸ء، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ۔

(۴) حیات عبدالحی ص ۱۷۹ تا ۱۸۱، بار اول ۲۰۰۱ء، سید احمد شہید اکیڈمی لکھنو

(۵) اس وقت تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور یقیناً سبھی اپنے کاموں کا صلہ رب کریم سے لے رہے ہوں گے، لیکن بعد کے لوگوں نے اس کا رخ بعض اشخاص کی طرف پھیر دیا اور پھر ایسے افسانے کہ اس میں سو شے نکلتے ہی رہے، مولانا شبلی سے اختلاف کی سب سے بڑی وجہ ندوے آنے سے قبل ان کی علی گڑھ تحریک سے وابستگی تھی، جس کو سید صاحب نے بھی نواب صدر یار جنگ کے مضمون کو تسلیم کرتے ہوئے حیات شبلی میں نقل کیا ہے کہ قدیم ذہن کے علماء ان کے علی گڑھ کے اختلاف سے قطع نظر یہی سمجھتے رہے کہ وہ تحریک ندوہ کو برباد کر دینا چاہتے ہیں، پھر مولانا شبلی کی ذہانت، دور اندیشی، ذکی الحسی اور تیز گامی کے ساتھ معاصرت سجدہ ریز ہو جاتی تو اسے معجزہ کہا جاتا، کیا بڑے بڑے محدثین وفقہا کے یہاں اس طرح معاصرانہ چشمک کی مثالیں نہیں ملتی ہیں؟ سید صاحب لکھتے ہیں: ''جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جاتی تھی اور اس کا کام آگے کو بڑھتا جاتا تھا، اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بنتا جاتا تھا، یعنی ندوہ کی کثرت میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی تھی، یہ گو واقعہ تھا، مگر اس واقعہ کو واقعہ سمجھ کر برداشت کر لے جانا ہر انسان کا کام نہیں، اس لیے رشک وحسد نے بے اعتمادی اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کیا۔ لیکن یہ کہنا کہ مولانا کے سوا ان کے تمام دوسرے مخالف رفقاء اخلاص اور حسن نیت سے خالی تھے، اک بڑی جرأت ہے، یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ مولانا کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سولہ برس علی گڑھ میں بسر ہوا تھا اور علی گڑھ تحریک سے ان کی وابستگی شہرت عام رکھتی تھی لیکن یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کو اس وابستگی کے با وجود اس تحریک کے بعض حصوں سے سراسر اختلاف تھا اور اسی بنا پر وہ ندوہ میں شامل ہوئے تھے، مگر عام علماء اور ان کے معتقد ارکان یہی سمجھتے تھے کہ یہ علی گڑھ تحریک کے آدمی ہیں اور علی گڑھ چھوڑ کر ندوہ میں اسی لیے شریک ہیں کہ اس مذہبی تحریک کو برباد کریں'' (حیات شبلی ص ۴۹۲) یہ بات بھی

صاف اور واضح ہے کہ مولانا شبلی سے اصل اختلاف مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری کا تھا، یہ الگ بات کہ اور دیگر لوگ ان کے حامی ہوگئے لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مولانا شبلی جیسا زیرک و دور اندیش اور روشن خیال شاید ہی ان میں کوئی ہو، ان کی یہ خصوصیت بھی ان کے لئے خلجان بنی، ''مولانا علی میاں لکھتے ہیں .....جس پر وہ اساتذہ وعلماء قابو نہیں پا سکتے تھے، جن میں سے کوئی تقریر وتحریر اور وسعت معلومات میں نہ علامہ شبلی کا ہم پلہ تھا..... (حیات عبدالحی ص۱۸۴) مزید لکھتے ہیں: ''اپنے خداداد کمالات، غیر معمولی علمی و ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر، نیز قدیم و جدید سے واقفیت، اور نہ صرف ملک بلکہ اس وقت کی دنیائے اسلام میں معروف و روشناس ہونے کی بنا پر دوسرا نام علامہ شبلی نعمانی کا آتا ہے، ندوۃ العلماء کے مقاصد وضروریات کا ایک اہم حصہ وہ ہے، جس کی نہ صرف تبلیغ وتشہیر بلکہ تکمیل کا فرض ارکان ندوۃ العلماء میں ان سے بہتر کوئی انجام نہیں دے سکتا تھا'' (حیات عبدالحی ص۱۷۴) مزید ایک جگہ لکھا ہے کہ شاید ہی ان کے جیسی اسلامی تاریخ پر کسی اور کی نظر ہو، یہ سب وہ اسباب ہیں جن کے سبب کسی طرح کی تقسیم وتعصب درست نہیں کہ ایسے واقعات سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے، ان ساری خصوصیات واسباب کے ساتھ شبلی کے مزاج کی حدت اور ان کی طبیعت کی جولانی نیز ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بھی ہر کسی کے لئے قابل قبول نہ تھی، نتیجہ جو ہونا تھا ہوا، اب جو لوگ سراسر ارکان ندوۃ العلماء کو شبلی مخالف قرار دیتے ہیں وہ بھی انتہا پسندی کا ثبوت دیتے ہیں اور جو انہیں بانی قرار دینے پر بضد ہیں وہ بھی تاریخ سے آنکھ چراتے ہیں، البتہ شبلی ندوے کی روح اور ندوے کی جان تھے اس میں کسی کو شک نہیں، قائدہ یہ ہے کہ ہر تحریر کی مکمل تصدیق وتائید نہیں جاسکتی اور ہر کتاب کو یکسر مسترد بھی نہیں کیا جاسکتا بعض تحریریں اور کتابیں اگر سراسر مداحی ومبالغہ پر مبنی ہیں تو اس میں بھی شک نہیں کہ بعض معتبر لوگوں کی تحریروں میں تنقید نہیں بلکہ تنقیص جھلکتی ہے، بہر حال کیا یہی ناخوشگواری دارالمصنفین کے معمار اول، تلامذہ شبلی میں سید الطائفہ کے لقب سے ملقب، شبلی کی باقیات کو زندہ کرنے اور افکار کو معنویت وتسلسل عطا کرنے والے سید سلیمان ندوی کے ساتھ نہیں پیش آئی، یہ سوچ کر خاموش رہنا بھی صحیح ہے کہ ذلك من تقدير العزيز العليم ورنہ مکاتیب شبلی کی روشنی میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ مولانا شیروانی ہر دو فریق کے یہاں مقبول ومعتبر تھے اور محترم بااثر بھی تھے، وہ اگر اپنی سی کوشش کر لیتے تو شاید یہ معاملہ ختم ہوگیا ہوتا لیکن مقدرات کا کیا جائے۔

(۶) سورہ توبہ آیت نمبر ۴۶

(۷) معارف، ص۱۶۶، شمارہ ۳ جلد ۱۷۶ ستمبر ۲۰۰۵ء

(۸) حیات شبلی ص۱۸۴، طبع جدید اکتوبر ۲۰۰۸، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

(۹) حیات عبدالحی ص۳۱۵، بار اول ۲۰۰۴ء، سید احمد شہید اکیڈمی لکھنو۔

وہ عبارت یوں ہے: ''وہ جب کسی معمولی سے معمولی موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو اس کو بہت دھوم دھام کے ساتھ بیان کرتے اور جب کوئی عربی یا فارسی کا شعر پڑھتے تو اس کا ترجمہ اور تشریح ضرور کرتے گویا ان کا مخاطب اس زبان سے نا آشنا یا بے علم ہے، وہ ہر زبان کے ماہر، نہایت نکتہ رس واقع ہوئے ہیں، اسی طرح کبھی کبھی ان کے سامنے کوئی شخص اپنی تحقیق بیان کرتا پھر وہ دوسروں کے سامنے اور خود اسی شخص کے سامنے اس کو اس آب وتاب کے ساتھ بیان کرتے گویا ان کی ذاتی تحقیق ہے، اور مخاطب کو اس سے انکار ہے، اسی طرح ان کو اپنے خیالات وتحقیق پر بہت زیادہ اعتماد تھا جو خود پسندی کی حد تک پہونچ گیا تھا''

(۱۰) حیات عبدالحی ص۳۱۴، بار اول ۲۰۰۴ء، سید احمد شہید اکیڈمی لکھنو۔

(۱۱) معارف ص۲۲۷، مارچ ۲۰۰۰ء، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔

(۱۲) مجالس حسنہ ص۳۳۴، بار اول مئی ۲۰۱۱، اداہ احیائے علم ودعوت لکھنو۔

(۱۳) م،س، ص۳۳۷ (۱۴) م،س، ص۴۸۸،

(۱۵) م،س، ص۵۹۱، (۱۶) م،س، ص۴۵۵،

(۱۷) م،س، ص۱۹۱، (۱۸) م،س، ص۲۶۵،

(۱۹) ماہنامہ ندائے اعتدال، ص۷۰، شمارہ ۹-۱۰، مارچ-اپریل ج۵، ۲۰۱۴ علی گڑھ

(۲۰) مطالعہ سلیمانی ص۵۵۸، طبع اول جون ۱۹۸۶ء، مرتبہ مسعود الرحمٰن خان۔

(۲۱) اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین، ص۳۵-۴۰، طباعت ۲۰۰۹ء، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

مذکورہ مقالہ عربی میں تھا، اردو ترجمہ مولانا سید سلمان الحسینی نے کیا ہے، یہ الگ سے ایک رسالہ کی شکل میں دارالمصنفین سے ہے شائع ہوا ہے

(۲۲) شذرات ص۹۰-۹۱، شمارہ ۲ جلد ۱۴۶، فروری ۲۰۰۰ء، اعظم گڑھ

جس وقت یہ سطریں پڑھ رہا تھا تو ذہن میں ایک واقعہ ابھی حال کا ہی ذہن میں تازہ ہوگیا، ہمارے یہاں رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار ۹-۱۰/

فروری ۲۰۱۳ء ہونا طے تھا، اچانک ۳۰ رجنوری کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کے داماد اور اس خاندان کے ایک روشن چراغ مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ کا انتقال ہوگیا، لیکن پھر بھی یہ سیمینار ملتوی نہ ہوا، یہ الگ بات کہ مولانا پہلے روز نہ آسکے لیکن دوسرے دن شریک ہوئے اور ان کی آمد اس کی کامیابی کا ذریعہ بنی۔

(۲۳) اسلام اور مستشرقین ج ۱ص ۷، ایڈیشن ۲۰۱۲ء، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

(۲۴) کاروان زندگی ج ۲ص ۲۹۸، باردوم ۱۹۹۸ء، مکتبہ اسلام لکھنو۔

(۲۵) اسلام ومستشرقین ج ۱،ص ۲۲-۲۳،

(۲۶) مجالس حسنہ ص ۲۶۴، باراول مئی ۲۰۱۱ء

(۲۷) مقدمہ ہجرت مصفطی، علاء ا ین ندوی (ص، د، ح)

(۲۸) نقوش اقبال ص ۱۴، طبع ۴، ۱۹۷۶، مجلس صحافت ونشریات لکھنو۔

(۲۹) مقدمہ گل رعنا، ص ۸، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

(۳۰) تاریخ دعوت وعزیمت ج ۳، ص ۲۴۴، آٹھواں ایڈیشن ۲۰۰۲ء، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو۔

(۳۱) شعرالعجم ج ۴ص ۱۴۲، طبع جدید ۲۰۰۷ء، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

(۳۲) حیات شبلی ص ۴۵۴، طبع جدید اکتوبر ۲۰۰۸ء دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

(۳۳) م،س،ص ۴۵۵، (۳۴) م،س،ص ۴۵۷،

(۳۵) م،س،ص ۶۵، (۳۶) م،س،ص ۴۶۱،

(۳۷) م،س،ص ۴۶۳،

مولانا نے اپنی تائید میں ہدایہ کی یہ عبارت پیش کی تھی والتضحیة فیها افضل من التصدق بثمن الاضحیة یعنی عیدالضحیٰ کی قربانی کے دنوں میں قربانی کی قیمت کے صدقہ کرنے سے قربانی کرنا بہتر ہے، (ہدایہ کتاب الاضحیۃ) اس عبارت کا مقصود یہ ہے کہ اگر قربانی کے جانور کی قیمت نقد خیرات کردی جائیں تو وہ اس صدقہ کا بھی ثواب ہوگا، مگر قربانی کی سنت کے ثواب سے محرومی رہے گی، جیسا کہ اس کے آگے کی عبارت میں تصیل ہے "لانها تقع واجبة أو سنة والتصدق تطوع محض فتفضل علیه"

(۳۸) حیات شبلی ص ۴۵۴، (۳۹) کلیات شبلی ص ۸۴،

(۴۰) کلیات شبلی ص ۸۵، (۴۱) کلیات شبلی ص ۸۷،

(۴۲) مفکر اسلام ایک مطالعہ، ص ۱۴۳-۱۴۴، طبع اول جنوری ۲۰۱۴ء، مرکز ثقافت وتحقیق علی گڑھ۔

(۴۳) سیرت سید احمد شہید، ج ۱ص ۴۲، نواں ایڈیشن ۲۰۱۱ء، مجلس تحقیقات نشریات اسلام، لکھنو۔

(۴۴) سیرت سید احمد شہید، ج ۱ص ۳۹،

(۴۵) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص ۲۲، سترہواں ایڈیشن، ۲۰۰۷ء، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو۔

(۴۶) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص ۳۰،

(۴۷) کاروان زندگی ج ۱ص ۴۹۲، باردوم ۱۹۹۴ء، مکتبہ اسلام، لکھنو۔

(۴۸) مقالات شبلی ج ۸ص ۶۴، طبع جدید ۲۰۱۰ء، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

(۴۹) کاروان زندگی ج ۵ص ۲۳۲،

(۵۰) خطبات شبلی ص ۵۹، طبع جدید ۲۰۰۸ء، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

(۵۱) مفکر اسلام ایک مطالعہ ص ۱۶۵،

(۵۲) عالم عربی کا المیہ ص ۱۵۹، باردوم ۱۹۸۰ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو۔

(۵۳) پاجا سراغ زندگی ص ۴۷، گیارہواں ایڈیشن ۲۰۱۱ء، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنو۔

(۵۴) خطبات شبلی ص ۱۱۱، (۵۵) خطبات شبلی ص ۱۱۳-۱۱۴،

(۵۶) ان تقاریر اور کوششوں کی جھلک مولانا کی کاروان زندگی کے صفحات میں نظر آتی ہے مزید تفصیلات اور مولانا کا درد دل محسوس کرنے کے لئے قاضی عدیل عباسی مرحوم کی تشکیل کردہ دینی تعلیمی کونسل کے صدارتی خطبات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، یہ خطبات ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی صاحب نے تکبیر مسلسل کے نام سے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔

(۵۷) سیرت محمد علی مونگیری ص ۲۶۷، محمد الحسنی طبع سوم ۲۰۰۵ء، مجلس صحافت و نشریات، ندوۃ العلماء لکھنو۔

(۵۸) کاروان زندگی ج ۷ص ۵۸-۶۳ طبع ۲۰۰۱ء، مکتبہ اسلام لکھنو۔

(۵۹) تاریخ ندوہ ج ۱ص ۱۵۷، طبع ۲۰۰۸ء، مجلس صحافت نشریات اسلام، لکھنو۔

(۶۰) مقالات شبلی، ج ۸،ص ۸۱،

(۶۱) علامہ شبلی کی سیرت النبی پہلے ہی ترکی زبان میں ۴ جلدوں میں شائع ہوچکی تھی۔

☆☆☆

اصلاح معاشرہ

عید میلاد النبی ﷺ منانا آخر کیوں منع ہے؟

مولانا ندیم احمد انصاری ایم اے، جرنلسٹ مہتمم مدرسہ نور محمدی ممبئی

لفظی اعتبار سے ہر اس دن کو عید کہتے ہیں جس میں کسی بڑے آدمی یا کسی بڑے واقعہ کی یاد منائی جائے۔ بعض نے کہا کہ عید کو عید اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ہر سال لوٹ کر آتی ہے۔ (المنجد: ۶۹۰، معجم الوسیط: ۶۳۵) ''عید'' کو عید کہنا ایک طرح کی نیک فالی اور اس تمنّا کا اظہار ہے کہ یہ روزِ مسرّت بار بار آئے۔ (قاموس الفقہ: ۴/۴۱۹) اور ''عید میلاد النبی ﷺ'' کے متعلق صاحبِ فیروز اللغات فرماتے ہیں ''عید میلاد النبی ﷺ کا مطلب ہے، پیغمبرِ اسلام کی ولادت کا دن۔'' (فیروز اللغات: ۹۰۸)

ولادتِ نبوی ﷺ کی صحیح تاریخ

تمام مؤرخین اور اصحابِ سیر کا اس پر تو اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ با سعادت پیر کے دن ہوئی، البتہ تاریخ میں شدید اختلاف ہے۔ ۲، ۸، ۹، ۱۰، اور ۱۲ تاریخیں بیان کی گئی ہیں اور وفات کے سلسلے میں ۱۲ ربیع الاول کو جب کہ ولادت کے سلسلے میں ۹ ربیع الاول کو ترجیح دی گئی ہے۔ شاید اسی لیے لوگوں کی زبانوں پر لفظ ''بارہ وفات'' کا رہتا ہے اور جشن عید میلاد النبی ﷺ کا مناتے ہیں۔ یا للعجب! (دیکھئے رحمۃ للعالمین: ۱/۳۵، سیرۃ النبی ﷺ للنعمانی: ۱/۱۰۹، سیرۃ المصطفیٰ لکاندھلوی: ۱/۵۱، موسوعۃ نضرۃ النعیم: ۱/۱۹۵، خطباتِ سیرت للندوی: ۸۳)

یومِ ولادتِ نبوی ﷺ

یومِ ولادتِ نبوی ﷺ یعنی اس عظیم الشان شخصیت کا جنم دن، جسے تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ وہ دن واقعی بڑی ہی عظمت و برکت کا حامل تھا۔ اس لیے کہ اس مبارک دن میں رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ اس عالمِ رنگ و بو میں تشریف لائے۔ اگرچہ شریعت نے سالانہ آقا کے یومِ ولادت کو ''منانے'' کا حکم نہیں دیا نہ اسے عید ہی قرار دیا، نہ ہی اس کے لیے کسی قسم کے مراسم مقرّر کیے، لیکن جس سال ماہِ ربیع الاول میں یہ دن آیا تھا، وہ نہایت ہی متبرک اور پیارا دن تھا۔ آج جو لوگ اس دن کو ''عید'' کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ اصلاً رسولِ خدا ﷺ کی نافرمانی کرتے ہیں، اس لیے کہ خود ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

اللہ تعالیٰ نے دیگر قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے عید کے دو دن مقرّر کیے ہیں: (۱) عید الفطر اور (۲) عید الاضحیٰ۔ یہ ارشاد اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا تھا جب کہ آپ

نے اہلِ مدینہ کو دوسرے دنوں میں زمانۂ جاہلیت کے طرز پر عید و خوشی مناتے دیکھا۔(ابوداود:۱۳۳۴،نسائی:۱۵۵۷)اس سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو گیا کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ماننے والوں کے لیے سالانہ صرف دو دنوں کو عید کے طور پر مقرر فرمایا،اس کے علاوہ بعض روایتوں میں جمعہ کے دن کو بھی عید کہا گیا ہے، اس کے علاوہ کسی دن کے متعلق عید کا لفظ وارد نہیں ہوا۔اب اگر کوئی اس پر زیاتی کر کے اپنی طرف سے مزید ایک دن بڑھاتا اور اس میں عید جیسی خوشیاں مناتا ہے،تو وہ گویا رحمۃ للعالمین ﷺ کے اس ارشادِ عالی پر عدم رضامندی کا اظہار کرتا ہے،اور جو اسے دین کا حصہ سمجھتا ہے، وہ اپنی طرف سے نیا دین تراشتا ہے،اور یہ دونوں ہی طریقۂ عمل نہایت خطرناک ہیں۔

عید میلاد النبی ﷺ کی ابتداء

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

یہ مروجہ مجلسِ میلاد قرآن کریم سے ثابت ہے نہ حدیث شریف سے۔نہ خلفاءِ راشدین و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ثابت ہے نہ تابعین و ائمہ مجتہدینؒ؛امام اعظم ابو حنیفہؒ،امام مالکؒ،امام شافعیؒ،امام احمدؒ وغیرہ سے ،نہ محدثین ؛امام بخاریؒ،امام مسلمؒ،امام ابوداودؒ،امام ترمذیؒ،امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہؒ وغیرہ سے اور نہ اولیاءِ کاملین؛ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ،خواجہ معین ا ین چشتی اجمیریؒ،خواجہ بہاء ا ین نقشبندیؒ اور شیخ عارف شہاب ا ین سہروردیؒ وغیرہ سے۔چھ صدیاں اس امت پر اس طرح گزر گئیں کہ اس مجلس کا کہیں وجود نہیں تھا۔سب سے پہلے بادشاہ اربل نے شاہانہ انتظام سے اس کو منعقد کیا اور اس پر بہت مال خرچ کیا، پھر اس کی حرص و اتباع میں وزراء و امراء نے اپنے اپنے انتظام سے مجالس منعقد کیں،اس کی تفصیل ''تاریخ ابن خلکان'' میں موجود ہے۔

اسی وقت سے علماءِ حق نے اس کی تردید بھی لکھی ہے، چنانچہ ''کتاب المدخل'' میں علامہ ابن الحجاج نے بتیس صفحات میں اس کے قبائح و مفاسد دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں لکھ ہیں۔۷۳۷ھ میں اس کی تصنیف سے فراغت حاصل ہوئی، پھر جہاں یہ مجلس پہنچتی گئی، وہاں کے علماء تردید فرماتے رہے۔چنانچہ عربی، فارسی اور اردو..... ہر زبان میں اس کی تردید موجود ہے اور آج تک تردید کی جا رہی ہے۔(فتاوی محمودیہ جدید:۳/۲۱۴-۲۱۳بتغیر)

بریلوی عالم کا اعتراف

بریلوی حضرات کے ایک عالم قاضی فضل احمد صاحب لکھتے ہیں:''یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ اس مخصوص شکل سے یہ عملِ خیر و برکت و نعمت ۶۰۴ھ سے جاری ہے''۔(مروجہ محفلِ میلاد:۵۲ملخصاً)

عیدِ میلاد کا حکم

اس سے بعض لوگ اس غلط بات کی طرف جاتے ہیں، گویا کہ ہم ذکر نبوی ﷺ کو منع کرتے ہیں۔نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! نفسِ ذکر میلاد فخر عالم علیہ السلام کو کوئی منع نہیں کرتا، بلکہ ذکرِ ولادت آپ ﷺ کا مثل ذکر دیگر سیر و حالات کے مندوب ہے۔(البراہین القاطعۃ علی ظلام انوار الساطعۃ:۱۴)لیکن اس زمانہ میں مجالسِ میلاد بہت سے منکرات و ممنوعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً ممنوع ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۳/۱۸۱جدید محقق)بالفاظِ دگر میلادِ مروجہ وقیام مروج جو امورِ محدثہ،ممنوعہ کو مشتمل ہے، ناجائز اور بدعت ہے۔(عزیز الفتاویٰ:۱۲۲،زکریا بکڈپو، دیوبند)

یومِ ولادتِ نبوی ﷺ یقیناً باعثِ خوشی اور اظہارِ مسرت

کا سبب ہے،لیکن اس تاریخ میں ہر سال اگر یہ دن ''منانے'' کا ہوتا،تو اس کے متعلق احکامات و ہدایات شریعتِ مطہرہ میں کثرت سے وارد ہوتیں۔ یہ خیال رکھنے کی بات ہے کہ یہ دن حضورﷺ اور صحابہ کرامؓ کے سامنے بھی تھا،تو جب خود حضورﷺ اور صحابہ کرامؓ نے اس خوشی کا اظہار مروجہ طریقہ پر نہیں کیا اور ''عیدِ میلاد'' نہیں منایا،تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شریعت میں اظہارِ خوشی کا یہ طریقہ درست نہیں،ورنہ آپﷺ اور آپﷺ کے صحابہ کرامؓ اس پر عمل کر کے اس کا جواز ضرور بتلاتے۔یہی ایک دلیل مروجہ میلاد کے غیر درست ہونے کے لیے کافی ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے:﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾۔(سورۃ المائدۃ:۳) آج میں نے تمھارے لیے دین کو کامل ومکمل کر دیا(اب اس میں کسی طرح کمی بیشی کی نجائش نہ رہی)اور تم پر اپنا انعام مکمل کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر راضی ہو گیا۔

نیز ارشادِ رسولﷺ ہے:جو ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کرے،جو دین میں سے نہیں ہے،وہ مردود ہے۔(بخاری:۲۶۹۷،مسلم:۶۷۱۸)

ایک دوسری روایت میں رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

تم میری سنّت کو لازم پکڑو اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کی سنّت کو لازم پکڑو،اسے ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑے رہو اور دین میں نئی باتیں ایجاد کرنے سے بچو،کیوں کہ دین میں پیدا کی گئی ہر نئی بات بدعت ہے،اور ہر بدعت گمراہی ہے۔(ابوداود:۴۶۰۷،ترمذی:۲۶۷۸،ابن ماجہ:۴۲)

کیا رسول اللہﷺ کا بس یہی حق امت پر ہے کہ سارے سال میں صرف ایک دن اور وہ بھی صرف تماشہ کے طور پر ،آپﷺ کا ذکرِ مبارک جھوٹے سچے رسالوں سے پڑھ دیا اور پھر سال بھر کے لیے فارغ ہو کر آئندہ بارہ وفات اور عیدِ میلاد کے منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔افسوس!مسلمانوں کا فرض تو یہ ہے کہ کوئی دن آپﷺ کے ذکرِ مبارک سے خالی نہ جائے،البتہ یہ ضروری نہیں کہ فقط ولادت کا ہی ذکر ہو،بلکہ کبھی آپﷺ کی نماز کا،کبھی آپکے روزے کا،کبھی جہاد کا،اور کبھی آپ کے اخلاق واعمال کا،جو کہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔کبھی ولادتِ با سعادت کا بھی ہو کہ یہ بھی باعثِ خیر و برکت ہے۔(جواہر الفقہ:۹۱/۴،امداد المفتیین:۱۶۳)

محبت کی علامت بھی یہی ہے کہ محبوب کی ہر بات کا ذکر ہو،ولادتِ شریفہ کا بھی،سخاوت اور عبادت کا بھی۔اس میں کسی مہینہ اور تاریخ اور مقام کی کوئی تخصیص نہیں،بلکہ دوسرے وظیفوں کی طرح روزمرہ اس کا وظیفہ ہونا چاہئے۔یہ نہیں کہ سال بھر میں مقررہ تاریخ پر یوم میلاد منا لیا جائے اور اس کے بعد کچھ نہیں۔حالاں کہ حضورﷺ کا ذکرِ مبارک تو غذا ہے،ہر وقت ہونا چاہئے،اس میں وقت کی تخصیص کی کیا ضرورت؟(الفضائل والاحکام:۱۱۱،امداد الفتاویٰ:۱۸۷/۱)

اس پوری تفصیل سے واضح ہو گیا کہ محفلِ میلاد میں اگر کوئی تاریخ معین اور ضروری نہ سمجھی جائے،شیرینی اور روشنی وغیرہ کو ضروری نہ سمجھا جائے،غلط روایات نہ پڑھی جائیں،نظم پڑھنے والے بے ریش نہ ہوں،اور گانے کی طرح نہ پڑھیں،اسی طرح دوسری بدعات سے خالی ہو،تو مضائقہ نہیں۔(امداد الفتاویٰ:۲۴۹/۵ ، وانظر نظام الفتاویٰ ، حصہ دوم : ۱۶۵/۱،

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دیوبند)

غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکرِ مبارک جب کہ ان رسوم و بدعات سے خالی ہو تو ثواب اور افضل ہے، اور اگر مروجہ طریقہ پر رسوم و بدعات سے بھرا ہو تو نیکی برباد گناہ لازم ہے۔ جیسے کوئی بیت الخلاء میں جاکر قرآن کریم کی تلاوت کرنے لگے۔ (جامع الفتاویٰ:۵۵۲/۲، ربانی بک ڈپو، دہلی، فتاوی عثمانی:۱۱۹/۱، کتب خانہ دیوبند)

المختصر! ہم مسلمان ہیں اور ہمیں اپنی خوشی اور غمی، ہر حالت میں شریعت کی اتباع کرنا واجب اور ضروری ہے اور شریعت میں امرِ مندوب پر اصرار کرنا اور واجب کی طرح اس کا التزام کرنا اتباعِ شیطان ہے۔ (عزیز الفتاویٰ:۱۴۲ بتغیر)

'اہل حدیث' علماء کا موقف

جناب مولانا مفتی ابو محمد عبدالستار صاحب فرماتے ہیں:

ہیئتِ مروجہ کے ساتھ مجلس میلاد کا انعقاد از روئے کتاب و سنت قطعاً حرام اور بدعت بلکہ داخل فی الشرک ہے، کیوں کہ اس کا ثبوت نہ تو خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، نہ کسی صحابیؓ سے، نہ کسی تابعیؒ سے۔ غرض قرونِ ثلاثہ میں اس کا وجود بالکل مفقود ہے، نہ ازمنہ ائمہ اربعہ میں اس کا پتہ لگتا ہے، بلکہ ساتویں صدی میں یہ بدعت بجانب خود ایجاد کی گئی ہے۔ (فتاویٰ ستاریہ:۶۴/۱)

جناب مولانا ثناء اللہ امرتسری فرماتے ہیں:

ہم مجلسِ میلاد کو کارِ ثواب نہیں جانتے۔ اس لیے کہ زمانۂ رسالت و خلافت میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ آگے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: مولود کی مجلس ایک مذہبی کام ہے، جس پر ثواب کی امید ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی کام پر ثواب کا بتلانا شرع شریف کا کام ہے، اس لیے کسی کام پر ثواب کی امید رکھنا، جس پر شرع شریف نے ثواب نہ بتلایا ہو، اس کام کو بدعت بنا دیتا ہے۔ مولود کی مجلس بھی اسی قسم سے ہے، کیوں کہ شریعتِ مطہرہ نے اس پر ثواب کا وعدہ نہیں کیا، اس لیے ثواب سمجھ کر تو یقیناً بدعت ہے، رہا محض محبت کی صورت، یہ بھی بدعت ہے۔ کیوں کہ رسول ﷺ سے محبت کرنا بھی ایک مذہبی حکم ہے، جس پر ثواب کی امید ہے۔ پس جس طریق سے شرع شریف نے محبت سکھائی ہے، اس طریق سے ہوگی تو سنّت، ورنہ بدعت۔ (فتاویٰ ثنائیہ:۱۱۹/۱)

مفتی اعظم مکہ مکرمہ کا فتویٰ

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ فرماتے ہیں:

مسلمانوں کے لیے ۱۲ ربیع الاول کی رات یا کسی اور رات میلاد النبی ﷺ کی محفل منعقد کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ نبی ﷺ کے علاوہ کسی اور کی ولادت کی محفل منعقد کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ میلاد کی محفلوں کا تعلق ان بدعات سے ہے، جو دین میں نئی پیدا کر لی گئی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی حیاتِ پاک میں کبھی اپنی محفلِ میلاد کا انعقاد نہیں فرمایا تھا، حالاں کہ آپ ﷺ دین کے تمام احکام کو بلا کم و کاست، من و عن پہنچانے والے تھے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مسائلِ شریعت کو بیان فرمانے والے تھے۔ آپ ﷺ نے محفلِ میلاد نہ خود منائی اور نہ کسی کو اس کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاءِ راشدین، حضراتِ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں سے کسی نے کبھی اس کا اہتمام نہیں کیا تھا، الخ۔ (مقالات وفتاویٰ:۱۴۰۶ اردو)

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ، وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ

☆☆☆

یادِ رفتگاں

آہ! حضرت مولانا قاری محمد قاسم صاحبؒ

اک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی

جمال احمد ندوی، استاذ حدیث جامعہ مصباح العلوم، کوپاگنج ضلع مئو، یوپی

قاری محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت پرکشش اور متواضع شخصیت کے مالک تھے، ان کی خوش الحانی کا سارا ہندوستان معترف ہے، راقم کی بالکل آخری ایام میں ملاقات ہوئی اور افسوس کہ خاطر خواہ استفادے کا موقع نہ ملا، غالباً ۲۰۱۳ء کے وسط میں اپنے کسی عزیز کے یہاں علیگڑھ تشریف لائے تو حضرت مولاناؒ کے نام کی نسبت سے ازراہ کرم اس ادارے میں بھی تشریف لائے اور فرمایا کہ دیکھیے آپ سے بعد میں اور آپ کے وا سے پہلے ملاقات ہوئی، دراصل جب وہ مولانا عبداللہ حسنیؒ صاحب کی تعزیت میں تشریف لا رہے تھے تو ناگ پور سے وہ جس جہاز پر سوار ہوئے اسی پر ہمارے وا محترم سے ملاقات ہوئی اور ان کے ذریعہ علی گڑھ کے اس ادارے کا تعارف ہوا، قاری صاحب کی دردمندی وفکر مندی اور ان کی لگن وتڑپ فروری ۲۰۱۴ء میں یہاں منعقد ہونے والی ''مفکر اسلام عالمی کانفرنس'' کے موقع پر دیکھنے کو ملی، کتنی بار فون کیا اور کتنے مشورے دیے ان کا شمار بھی ممکن نہیں لیکن یہ ضرور کہ وہ اپنی یادیں چھوڑ گئے، ہمارے یہاں دوسری مرتبہ وہ اسی کانفرنس میں تشریف لائے، اختتامی نشست کا آغاز ان ہی کی تلاوت سے ہوا تھا، ان کے انتقال سے ایک اور مخلص بندۂ خدا کی جگہ خالی ہوگئی، ہم بہت ممنون ہیں کہ جناب جمال احمد ندوی صاحب نے قاری صاحب سے متعلق یادیں لکھ کر ہمارے رسالے کو عنایت کیں (مدیر)

قاری محمد قاسم صاحب ''دارالاقبال'' شہر بھوپال کے ایک ممتاز دینی علمی خاندان میں ۱۹۵۶ء میں تاریخ ساز شخصیتوں کے مو و مسکن محلّہ چھاؤنی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خانوادہ دینی علمی اور قرآنی خدمت میں اپنی منفرد اور نمایاں شناخت رکھتا ہے۔ آپ کے دادا جان جناب قاری حافظ محمد طیب صاحب ایک ماہر قاری صوفی باصفا حافظ قرآن تھے۔ ان کا دل قرآنی خدمت سے سرشار اور علوم دینیہ سے معمور تھا۔ تقریباً ۲۸ رسال تک مشہور بزرگ ولی کامل شیخ طریقت حضرت مولانا محمد یعقوب مجددیؒ آپ کو قرآن سناتے رہے اور وہ ان کی خانقاہ کے حاضر باش ارادت مندوں میں سے تھے، آپ کی فطری نجابت کا مظہر ہے کہ آپ مسجد کلثوم بی میں تقریباً ۵۰ رسال تک امامت کا فریضہ انجام دیتے رہے، نیز آپ کے وا ماجد حافظ قاری عبدالحفیظ صاحب بھی ایک کہنہ مشق قاری اور معتبر حافظ قرآن تھے، محلے کی مسجد میں تاحیات امامت کی خدمت انجام دیتے رہے اور آپ کے تمام بھائی بھی قرآن سے لگاؤ اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ کا خانوادہ قرآنی خدمت کے تعلق سے اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے۔

آپ نے اپنا پورا تعلیمی مرحلہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ ترجمہ والی مسجد (موجودہ صدر دفتر جمعیۃ العلماء ہند، ایم۔پی۔) میں طے کیا۔ فن تجوید وقرأت مشہور زمانہ قاری لطیف الرحمٰن یمنی سے حاصل کی اس فن میں مشق و ریاض اور فضل خداوندی سے

غیر معمولی درجہ پر فائز ہوئے۔ فراغت کے بعد جہاندیدہ روشن دماغ بالغ نظر عالم دین حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی زیر سرپرستی اور اپنے وا ین کی دعاؤں سے عملی زندگی شروع کی، محنت، لگن اور مقصد زندگی کو پیش نظر رکھ کر منزل کی طرف گامزن رہے۔

آپ کی شخصیت میں فطری اعتدال و توازن، علمی متانت و سنجیدگی، ملی دردمندی، دینی بیداری اور قرآن اور قرآنیات سے غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ فیضان الٰہی نے غیر معمولی ذہانت و فطانت، حسن اخلاق، ذوق جمال، انسانیت نوازی، مؤمنانہ بصیرت، خوردہ نوازی، سادگی و شرافت اور مروت و ہمدردی سے بہرور کیا تھا۔ آپ ایک ماہر فن قاری، عالم باعمل، دیدہ ور مفسر، خوش بیاں واعظ اور خلیق وملنسار انسان بھی تھے، ''افسوس کہ یہ خوش خلقی کا عنصر طبقہ علماء میں بھی نایاب ہوتا جارہا ہے''۔ آپ کی پرکشش شخصیت، عوامی مقبولیت اور اکابر علماء کی توجہات کی حصول یابی میں بہت زیادہ دخل ان کے بے ریا خلوص، فطری نجابت، طہارت و پاکیزگی اور اخلاق و مروت کے باوصف خدمت قرآن کریم کی کارفرمائی اور جلوہ گری بھی رہی ہے۔ اسی نسبت کا فیض تھا کہ نوعمری ہی میں صوبائی، قومی اور بین الاقوامی مظاہرہ قرأت عالمی سیمناروں اور کانفرنسوں میں شریک ہوکر ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے کامیابی سے ہمکنار ہوئے جس سے آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا، جن ملکوں کے اسفار کئے ان میں سرفہرست سعودی عرب، دبئی، عراق، اردن، ایران، پاکستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا اور ملیشیا وغیرہ ہیں۔ ان ملکوں کی سیاحت فیضان قرآنی کا ثمرہ نہیں تو اور کیا؟ ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما.....الخ کا عملی مظہر ہی ہے۔

آپ کی شخصیت قرآن کریم سے متعارف رہی ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ آپ نے شب و روز کا عملی محور کلام الٰہی کو بنالیا تھا۔ جس مجلس میں آپ جلوہ افروز ہوتے آپ تلاوت کلام ربانی سے مجلس کو پرنور اور پرسکینت بنادیتے تھے یہ قرآنی شرف ہی تھا کہ آپ نے شہر بھوپال میں مسجد کلثوم بی میں تقریباً ۳۵ رسال قبل سب سے پہلے درس قرآن کریم کا زریں سلسلہ شروع کیا تھا۔ آج بھی مختلف مساجد میں یہ مقدس سلسلہ جاری ہے، نیز مدراس جیسے غیر علمی شہر میں آپ امامت وخطابت، وعظ وتبلیغ اور اصلاح معاشرہ کی خدمت انجام دیتے رہے، مسجد مسجد قرآنی دروس کے حلقے قائم کرکے فہم قرآنی کی شمع کو فروزاں کئے ہوئے تھے۔ وہاں کے مذہبی، ملی اور دیگر سماجی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، باہمی رواداری اور مسلکی توسع سے دوسرے حلقوں میں بھی مقبولیت سے سرفراز ہوتے رہے۔ ماہ رمضان میں بعد تراویح قرآن شناسی اور منشأ الٰہی کی نشر واشاعت کیلئے خلاصۂ تراویح کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ پھر اس کو کتابی شکل میں شائع بھی کیا۔ نہایت دل نشیں اور پراثر اسلوب میں افادۂ عام کیلئے مختلف زبانوں میں شائع کیا۔ اردو زبان میں بنام ''قرآنی تعلیمات کا خاکہ'' ہے جو خاص و عام میں مقبول ہے اور اس سلسلہ کو مختلف اخبارات شائع بھی کرتے رہے۔ آپ کے فہم قرآنی کی داد مفسر قرآن مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب بھی دیتے تھے، اور آپ کو نوجواں صالح اور موفق من اللہ جیسے لقب سے یاد کرتے تھے، آپ کے مرشد ومربی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے خانوادہ کے لوگ بھی آپ کی پرسوز درد انگیز قرأت سنا کرتے تھے، جس میں صناعی اور تکلف کی آمیزش نہیں ہوتی تھی، آپ نے اپنے شیخ اور ان کے خانوادہ سے ارادت مندی کا تعلق تادم آخر باقی رکھا جیسا کہ آپ کے سانحۂ ارتحال پر مرشدی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے بجا فرمایا تھا: ''حضرت قاری صاحب ہمارے خانوادے کے ایک فرد تھے'' یہ ایک بہترین خراج عقیدت ہے، راقم سطور کا سینہ حضرت قاری صاحب کے ملفوظات

اوران کی یادوں کا دفینہ ہے، ایک واقعہ پیش خدمت ہے: مدراس کے سفر پہ تھا کہ ایک اشتہار پہ نظر پڑی ''درس قرآن کا افتتاح'' حضرت قاری صاحب کا نام نامی اشتہار میں دیکھ کر مسجد پہونچا، نورانی ماحول میں کلام الٰہی کے انسانی ہدایت ہونے پر سیر حاصل گفتگو فرمائی اور ملت کی سربلندی اور سرفرازی کے لئے قرآن کے دامن سے وابستگی پر زور دیتے رہے، دوران گفتگو فرمایا کہ اللہ کے فضل سے ایک مقدس مجلس کا آغاز ہوا، اب دیکھنا ہے کہ حسن اختتام کب ہوتا ہے؟ میں کہاں! یہ فضل خداوندی ہے کہ قادر مطلق کا کلام اور بندۂ ناتواں کی کوشش، مگر یہی حقیر کوشش نجات اخروی کا باعث بن جائے تو زہے نصیب'' مگر میری دلی خواہش ہے کہ میرا خاتمہ انہیں دروس قرآنیہ میں ہو'' اللہ نے یہ دعا قبول فرمائی کہ جس روز آپ کا انتقال ہوا جمعہ میں بیان فرمایا مغرب کی امامت فرمائی اور بعد نماز عشاء مسجد قدوسیہ میں ایک گھنٹہ سے زائد قرآن کا درس دیا۔ اور سامعین کی فرمائش پہ سورہ طٰہٰ کے دو رکوع کی تلاوت فرمائی، یہ حسن خاتمہ کی روشن دلیل ہے۔

واضح رہے کہ قاری محمد قاسم صاحب حج وزیارت کے بابرکت سفر پر جانیوالے تھے، دو روز قبل ۱۱ راگست ۲۰۱۴ء بروز بدھ اپنے اعزاء واقارب سے ملنے اپنے آبائی وطن تشریف لائے تھے، بظاہر طبیعت ٹھیک تھی کسی قسم کا کوئی عارضہ نہ تھا۔ بعد نماز عشاء درس قرآن دیا پھر دیر سے گھر پہونچے، بھائیوں کے ہمراہ کھانا تناول فرمایا، دیر تک محو گفتگو رہے۔ جب سب بھائی سو گئے تو عاشق قرآن اپنے رب کے آغوش میں جانے کیلئے پر تولنے لگا۔ اسباب کی دنیا میں بظاہر سینہ میں کچھ درد محسوس ہوا۔ تو اہلیہ سے کہا کسی کو بیدار مت کرو، چلو ہم خود اسپتال چلتے ہیں۔ مگر بھائی بیدار ہو گئے، لوگ یہ تصور کر رہے تھے کہ شفاخانہ جارہے ہیں، نہیں نہیں وہ تو اپنے رب کے مہمان خانہ (جنت) کی طرف کوچ کر رہے تھے راستہ ہی میں روح قفص عنصری سے پرواز کر گئی۔ ۱۳ راگست بروز جمعہ سنیچر کی درمیانی شب میں راہی ملک عدم ہو گئے۔

شخصیت کے تشکیلی عناصر

کسی بھی عظیم شخصیت کی عظمت وسربلندی اور مقبولیت میں کچھ داخلی وخارجی عناصر کی کارفرمائی ناگزیر ہوتی ہے، حضرت قاری صاحب کی تعلیم وتربیت میں جہاں آپ کے خانوادہ کا دینی علمی قرآنی ماحول اور شاہ محمد یعقوب مجددی کا فیض تھا وہیں اپنے دور کے بزرگ اکابر علماء کی بھی تربیت ورہنمائی اور حوصلہ افزائی ہے جن کی سرپرستی کو آپ نے غنیمت سمجھ کر اپنی بساط بھر کوشش کرتے رہے۔ ان میں سرفہرست حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عمران خاں صاحب ندوی سابق مہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا منت اللہ رحمانی، قاضی مجاہدالاسلام قاسمی، مفسر قرآن مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا سید رابع حسنی ندوی اور آپ کے پیرومرشد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام نامی واسم گرامی ہیں۔

حضرت قاری صاحب اپنے پیش رو بزرگوں کے ملفوظات اور مواعظ کو اپنے بیان اور نجی مجلسوں میں عجیب پرکیف انداز میں بیان فرماتے تھے۔ حضرت قاری محمد طیب صاحب، مولانا علی میاں صاحب اور مولانا عمران خاں ندوی کی باتیں اور ان کے افکار و خیالات سے مجلس کو زعفران زار بنائے رہتے تھے۔ بزرگوں کی نسبت وتعلق کا بڑا پاس ولحاظ رکھتے تھے۔ اور ان کی قربانیوں سے نسل نو کو آگاہ کرتے تھے۔ آپ کی شخصیت کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنوبی ہند میں قرآن وسنت کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ ملی اور سماجی خدمت کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔ آپ مختلف اداروں اور تنظیموں کے رکن رکین رہے

جن میں آپ کی سنجیدہ گفتگو اور عمدہ رائے کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا رہا۔ ان میں سرفہرست مسلم پرسنل لا بورڈ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم وقف دیوبند، ملی کونسل اور مجلس مشاورت وغیرہ ہے۔

حضرت قاری صاحب سے راقم کا تعلق

۲۵ رمئی بروز جمعہ کو ۲۰۰۷ء مدراس کیلئے رخت سفر باندھا۔ وطن مالوف سے نکلنے سے پہلے ہی عزم مصمم تھا کہ اس بار نا گپور ٹھہر کر داعی اسلام مفسر قرآن مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب کی عیادت بھی کی جائے گی، کیونکہ مولانا ان دونوں صاحب فراش تھے۔ ندوہ کے تعلیمی دور میں مولانا کی زیارت اور ان کے بیانات سے مستفید ہوتا رہا۔ چنانچہ ۲۵ رمئی بروز جمعہ بعد نماز عصر زیارت و ملاقات سے مشرف ہوا۔ پیرانہ سالی، ضعف و نقاہت اور عدم بینائی کے باوجود بڑی ایمان بخش اور بصیرت افروز گفتگو فرماتے رہے۔ ندویت کے لاحقہ سے شفقت و محبت میں چنداں اضافہ فرمایا، انتہائی خوشگوار ماحول میں ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ازراہ ہمدردی دریافت فرمایا: کہاں جانا ہے؟ میں نے کہا: مدراس کا ارادہ ہے۔ فرمایا: وہاں ایک بڑے اللہ والے بزرگ عالم دین قاری محمد قاسم صاحب پیری میٹ مسجد میں رہتے ہیں، ان سے ملتے رہئے۔ ان کے علم وفن اور ذوق قرآنی سے مستفید ہوتے رہئے اور قاری صاحب کا رابطہ نمبر بھی دیا اور کہا: میرے حوالے سے ان سے گفتگو کیجئے گا۔ ۲ رجون بروز جمعہ مدراس پہنچتے ہی قاری صاحب سے رابطہ کیا۔ انہوں نے فرمایا: نماز جمعہ میں آیئے اور ملاقات کے بعد خصوصی توجہ کا معاملہ فرمایا۔ گھر پر لے گئے اور ظہرانہ سے فارغ ہوکر کچھ دیر محو گفتگو رہے، پھر میں اپنے قیام گاہ چلا آیا۔ اس سفر میں روزانہ ملاقات ہوتی رہی، پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا، ان کی خوردہ نوازی اور پرخلوص شفقت دامن دل کو اپنی طرف کھینچنے لگی اور ان کی پرخلوص شخصیت کے سحر نے میری ہستی کو اپنا اسیر بنالیا تھا جب بھی جنوب کی طرف جاتا تھا آپ کے در پہ حاضری کو اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔ ڈھیر ساری دعاؤں اور محبتوں کی سوغات لیکر واپس آتا، ادھر دو سال میری حقیر دعوت پر ہمارے وطن کوپا گنج، ضلع مئو (یو۔پی۔) میں تشریف لائے اور وعظ بھی فرمایا۔ ۲۵ رشعبان ۱۴۳۵ھ کو عظیم الشان جلسۂ اصلاح معاشرہ میں شریک ہوکر سیرت طیبہ پر قرآنی حوالے سے بہت ہی پرمغز خطاب فرمایا تھا کہ آج بھی اس نورانی و قرآنی مجلس کا فیض محسوس ہورہا ہے۔ وفات سے چند روز قبل ہی خط و کتابت اور گفتگو ہوئی تھی۔ اپنی کتاب ''قرآنی تعلیمات کا خاکہ'' بھیجا تو یہ بھی تحریر فرمایا کہ: آپ اس پر اصلاحی نظر ڈالیں اور مفید مشوروں سے نوازیں۔ گذشتہ سال علی گڑھ میں سہ روزہ عالمی سیمینار بہ عنوان "موقف الشیخ الامام ابی الحسن الندوی من الافکار المعاصرة دراسة مقارنة" ۲۲ تا ۲۴ رفروری ۲۰۱۴ء زیر اہتمام مدرسہ العلوم الاسلامیہ علی گڈھ میں اپنا مقالہ پیش کرنے سے قبل یہ کہہ کر دیا کہ نظر ثانی کرلیں جہاں میں خود شرمسار ہوا ساتھ ہی ان کی تواضع وانکساری اور بے نفسی سے روشناش ہوا۔ وہ سچ مچ عالم باعمل تھے، وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول کے حقیقی مصداق تھے۔ "من علم و علم و عمل بما علم فهو عالم" جو شخص علم دین سیکھے پھر دوسروں کو سکھائے اور اپنے علم پر عمل پیرا بھی ہو تو وہ حقیقی عالم ہے۔

حضرت قاری صاحب نے پس ماندہ گان میں اہلیہ اور بچے حافظ قاری محمد عاصم، محمد ناظم اور ایک بچی چھوڑے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کے پس ماندہ گان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆

سبق آموز

کسی کو برا کہنے کا انجام پہلے برسوں میں اب دنوں میں

محمد الیاس ندوی بھٹکلی
nadviacademy@hotmail.com

مغرب کی نماز مکمل کر کے جیسے ہی امام صاحب نے سلام پھیرا، پچھلی صف سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا:۔

''میرے بھائیو:۔ میری بچی بہت بیمار ہے، اس کو کینسر ہو گیا ہے، میں مجبور اور معذور ہوں، آپ میری مدد کیجئے''

وہ اپنی بات مکمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ صف میں موجود کئی مصلیوں نے بیک آواز اس کو خاموش کر کے بٹھا دیا اور اس سے یوں کہا گیا کہ مسجد میں نہیں مانگتے، باہر جا کے مانگو، میں سنتوں سے فراغت کے بعد مسجد سے باہر نکل رہا تھا تو دیکھا کہ وہ مجبور و مسکین مسجد کی سیڑھیوں پر اپنی چادر پھیلا کر بیٹھا ہوا ہے اور اس میں کچھ مصلیوں کی طرف سے رقم بھی پڑی ہوئی ہے، میرے پیچھے ہی وہ صاحب بھی آ گئے جو شہر کے ایک سرمایہ دار بھی تھے اور جنھوں نے ان کو سلام کے بعد امداد کے لیے اعلان سے ترش لہجہ میں منع کیا تھا، اس کو باہر مسجد کی سیڑھی پر بیٹھا دیکھ کر ان کا پارہ چڑھ گیا، اس کو مخاطب کر کے کہنے لگے:

''تم مسجد کے کمپاؤنڈ سے ابھی نکل جاؤ، باہر جا کر مانگو، بیماری کا بہانہ کر کے بھیک مانگتے ہو، جھوٹ بولتے ہو، ہٹے کٹے ہو کماتے نہیں ہو'' غرض یہ کہ اس کو انہوں نے اپنے سامنے ہی برا بھلا کہتے ہوئے اسی وقت سڑک پر بھیج کر ہی دم لیا، وہ بڑے نیک انسان تھے، شہر کے دیندار رؤساء میں ان کا شمار ہوتا تھا، لیکن ان کو اس بات کا استحضار نہیں رہا کہ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں فقیروں اور مسکینوں کو قطع نظر اس کہ وہ مستحق ہیں یا نہیں جھڑکنے، ڈانٹنے اور برا بھلا کہنے سے سختی سے منع کیا ہے، کسی کی دل آزاری و توہین اللہ پاک کو سخت ناپسند ہے اور اس کا بدلہ دنیا ہی میں فوری مل جاتا ہے۔

چند ہی دن گذرے تھے، وہ صاحب اتفاق سے اسی مسجد اور اسی نماز کے بعد اسی جگہ مجھے ملے، کہنے لگے:۔ مولانا:۔ میری چھوٹی بیٹی کے لیے خاص دعا فرمایئے، اس کو بلڈ کینسر ہو گیا ہے، میں نے دل ہی دل میں کہا کہ ایک زمانہ تھا کسی کو برا بھلا کہنے پر یا کسی کا دل دکھانے یا عار دلانے پر برسوں کے بعد اس کے بُرے انجام و نتیجہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اب تو زمانہ ترقی یافتہ اور معاملہ نقدی ہو گیا ہے، اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کی طرح برسوں کے بجائے اب لمحوں اور دنوں میں ہی اس

کے نتائج سامنے آجاتے ہیں۔

ایک دوسرا واقعہ بھی عبرت کے لیے سننے سے تعلق رکھتا ہے، ماضی قریب کی بات ہے، ایک صاحب کی کنواری بچی ایک غیر رشتہ دار مرد کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی، شہر میں اس کا چرچہ ہونے لگا، ایک جگہ اس واقعہ کا ذکر ہورہا تھا، اس مجلس میں ایک صاحب جو شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اس گفتگو میں شریک تھے کہنے لگے کہ اس بچی کے باپ کو شرم سے ڈوب کر مرجانا چاہیے، ان کی بچی نے خود ان کے خاندان کا نہیں بلکہ پوری قوم کا نام بدنام کردیا ہے، بے جا لاڈ پیار نے ان کو یہ دن دکھائے ہیں وغیرہ وغیرہ، چند ماہ بھی نہیں گذرے تھے ان کے ایک بچہ کے متعلق جو گاؤں سے باہر ایک بڑے شہر میں زیر تعلیم تھا ایک غیر مسلم ہندو کے ساتھ بھاگ جانے کی اطلاع آئی، کچھ ماہ کے لیے وہ خود شرمسار ہوکر شہر سے باہر جاکر مقیم ہوگئے۔

تیسرا عبرت انگیز واقعہ بھی سنئے، ایک صاحب تھے، ان کا گھرانہ نہایت دیندار، وہ خود آخری درجہ کے متدین نمازی ہی نہیں بلکہ تہجد گذار اور تکبیر اولی کے بھی پابند، ان کے ایک صاحب زادے کے متعلق خبر آئی کہ بگڑتے بگڑتے ایک غلط کام میں پکڑے گئے ہیں، پورا شہر پریشان اتنے نیک وا کا بیٹا ایسا کیسے ہوگیا، آخر کیا ماجرا ہے؟ سب کو یقین تھا کہ انھوں نے ایک لقمہ بھی اپنی اولاد کو حرام کمائی کا نہیں کھلایا تھا، نہ اپنی اولاد کو اتنے روپئے پیسے دیئے تھے کہ وہ عیاشی کے عادی ہوسکیں، آخر ان سے کیا گناہ سرزد ہوگیا کہ ان کو یہ بُرے دن جیتے جی دیکھنے پڑے، سب اس کے اسباب جاننے کے لیے بے چین تھے، آخر ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ان کے ایک عمر رسیدہ دوست اور ساتھی نے یہ عقدہ حل کرلیا، وہ کہنے لگے کہ وہ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے، بچوں کو شرارت اور حکم عدولی کرتے دیکھتے تو ان کو ایسے الفاظ سے اپنی مادری زبان میں ڈانٹتے جس کا ترجمہ جھوٹا، گدھا، بندر اور جانور سے کیا جاتا ہے، اسی طرح دوسرے کے بچوں کو بھی راستہ یا گلی محلّہ میں شرارت کرتے دیکھتے تو غصہ میں کہتے کہ ''بدتمیز:۔ تمہیں کس بدمعاش باپ نے جنا ہے''، ان کا کہنا تھا کہ آج ان کا یہ بچہ جو ناخلف اور آوارہ بن گیا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے، عوام کے لیے بھی گتھی سلجھ گئی، ایک تو انہوں نے دوسروں کے بچوں کو طعنہ دیا اور عار دلایا، دوسرے خود اپنے بچوں کو ڈانٹتے وقت غصہ میں غیر شعوری طور پر سہی ایسے گالی کے الفاظ استعمال کئے جس کو وہ خود دوسروں سے اپنے بچوں کے حق میں سننا گوارہ نہیں کرسکتے تھے، یہ دونوں باتیں اللہ تعالی کو سخت ناپسند ہوئیں، اس لیے اللہ تعالی نے جیتے جی ان کو اس کا نتیجہ خود ان کی ناخلف اولاد کی شکل میں دکھایا۔

آپ ان تینوں واقعات کے محرکات، اسباب اور نتائج کا تجزیہ کیجئے، اس میں آپ کو مشترک طور پر جو سبب نظر آئے گا وہ ہے دوسروں کو عار دلانا، کسی کی دل آزاری کرنا اور طعنہ دینا، یہ وہ عادتیں و خصلتیں ہیں جس کا جیتے جی بُرا نتیجہ اللہ تعالی دنیا ہی میں دکھادیتے ہیں جیسا کہ ان مذکورہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے جو شخص اپنے کسی بھائی کو اس کے کسی گناہ پر عار دلائے گا یعنی طعنہ دے گا مرنے سے

پہلے اس گناہ کے اندر اللہ تعالی خود اس کو مبتلا کر دیں گے، مَنْ عَيَّرَ اَخَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتىَّ يَعْمَلَهُ

اپنی اولاد کی نیک نامی و بدنامی کا ذریعہ خود ان کے والدین ہی ہوتے ہیں، ان کی تعلیم و تربیت میں توجہ و انہماک ہی ان کو نیک نام کرتی ہے اور اس سلسلہ میں والدین کی کوتاہی یعنی ان کو گالی گلوچ، غیر شعوری طور پر غصہ کی حالت میں ان کو برا بھلا کہنے اور دوسروں کی اولاد پر طعنہ کسنے سے ہمارے لیے اس طرح کے برے دنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، والدین کی دعائیں جس طرح بچوں کے حق میں جلد قبول ہوتی ہیں اسی طرح اپنے بچوں کے لیے غیر شعوری طور پر ہی سہی غصہ کی حالت میں زبان سے نکلنے والے بددعائیہ کلمات بھی اپنا فوری اثر دکھاتے ہیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس پوری صدی میں نہ صرف برِصغیر بلکہ پورے عالم اسلام و عالم انسانیت میں اللہ تعالی کے ان چنیدہ و منتخب بندوں میں تھے جن کو اللہ نے آخری درجہ کی مقبولیت اور محبوبیت سے نوازا تھا، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے بعد تیرہ سو سال کے وقفہ میں پہلی دفعہ شاہ فہد مرحوم کے زمانہ میں کعبۃ اللہ کے عمارت کی بنیاد کی کھدائی کے ساتھ از سرنو تعمیر ہوئی، کلید بردار متولی کعبہ نے اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں ملنے والے سب سے بڑے اعزاز یعنی کعبۃ اللہ کے افتتاح کے لیے دنیا بھر کے سربراہوں و حکمراں خاندان کے دسیوں شہزادوں اور علماء و صلحا کی موجودگی میں مفکر اسلامؒ کو اس اعزاز و سعادت کے لیے منتخب فرما کر کلید کعبہ ان کے حوالہ کی، جیتے جی عالم اسلام میں بہت کم لوگوں کے علمی و دینی تحقیقات کے حوالے جمعہ کے دن حرم شریف کے منبر و محراب سے سنے گئے، لیکن اس صدی میں یہ اعزاز مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھا کہ ان کی زندگی ہی میں حرمین شریفین کے جمعہ کے خطبات میں ائمہ حرم اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے امام بصریؒ اور امام ابن تیمیہؒ کی طرح مولانا کے علمی اقتباسات کے حوالہ دیتے تھے، دنیا کے بڑے بڑے مسلم حکمرانوں کی نماز غائبانہ حرمین شریفین میں ادا نہیں کی جاتی لیکن مفکر اسلام کی وفات پر رمضان شریف میں ۲۷ لاکھ بندگان خدا نے حرم مکی اور ۱۵ لاکھ لوگوں نے حرم مدنی میں آپ کی نماز غائبانہ ادا کی، ۲۳/ رمضان المبارک کو روزہ کی حالت میں عین جمعہ کے موقع پر سورہ یس کی تلاوت کرتے ہوئے آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، آپ کی وفات کے صرف آٹھ سال کے عرصہ میں سو سے زائد کتابیں آپ کے متعلق دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھی گئیں، عنداللہ قبولیت کے یہ آثار دنیا ہی میں آپ پر جو ظاہر ہوئے اس کو محض فضل خداوندی کے علاوہ اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اسی کے ساتھ مولانا کے والدین بالخصوص ان کی والدہ کے انداز تربیت کا ان کی اس نیک نامی و صالحیت میں اہم حصہ تھا۔

مفکر اسلام خود فرماتے تھے کہ ان کی والدہ نے ان کی تربیت میں جن اہم باتوں پر سب سے زیادہ توجہ دی وہ یہ کہ میرے پیٹ میں حرام ہی نہیں بلکہ مشتبہ لقمہ بھی نہ پہنچ پائے، دوم یہ کہ میں کسی کی دل آزاری نہ کروں، ایک دفعہ میرا

بچپن میں اپنے گھر کی خادمہ کے ہم عمر بچہ کے ساتھ کھیل کے دوران جھگڑا ہو گیا اور میں نے بھی جواباً اس کو مارا، میری وا ہ کو جب اس کا علم ہو گیا تو میرے سامنے اس بچہ کو بلا کر مجھے مارنے کا حکم دیا، اس دن سے ظلم کے خلاف میرے دل میں ایسی نفرت بیٹھ گئی کہ میں اپنا جائز حق لینے کے لیے بھی ہمیشہ کسی پر ہاتھ اٹھانے سے باز رہا، نماز کے سلسلہ میں کوتاہی ان کے یہاں ناقابل معافی تھی، اگر میں کبھی عشاء سے پہلے تھک کر سو جاتا تو ہر حال میں مجھے اٹھا کر نماز پڑھوا کر ہی دوبارہ سلاتی، اسی کے ساتھ جو اہم ترین نکتہ ان کی تربیت کے سلسلہ میں ہمیشہ ان کے لیے واجب العمل رہا وہ سننے سے تعلق رکھتا ہے، مولانا فرماتے ہیں'' زندگی بھر وفات تک میری وا ہ ہمیشہ دو رکعت صلاۃ الحاجۃ میرے لیے پڑھ کر یہ دعا اللہ سے کرتی رہی کہ ائے اللہ :۔ میرے علی سے کوئی ایسا کام نہ کرا جس سے اس کی یا ملت کی بدنامی ہو، اس کو غلط کاموں سے ہمیشہ بچا''۔

حضرت مولانا کی وا ہ کے اس تربیتی نہج کی روشنی میں ہم اپنا جائزہ لیں کہ کیا ہم اپنی اولاد کے سلسلہ میں ان اصولوں پر کاربند ہیں؟ کیا ہم اپنی اولاد کا نام لے کر اللہ تعالی سے روزانہ دعا کرتے ہیں؟ ہم تو اپنی اولاد کے لیے اچھی جگہ شادی، بہتر روزگار، صحت وعافیت اور امتحان میں اچھے نمبرات سے کامیابی کے لیے شاید دعا کرتے ہوں، لیکن کیا ہم اپنے نونہالوں کا نام لے کر اللہ تعالی سے یہ التجا بھی کبھی کرتے ہیں کہ ائے اللہ:۔ میرے بیٹے عبداللہ اور بیٹی فاطمہ وعائشہ کو غلط حرکتوں، بدنامی اور گناہوں کے کاموں سے بچا کر دین کی اشاعت وتبلیغ کے لیے قبول فرما، اس کا جواب ہم میں سے اکثریت کا شاید نفی میں ہوگا، صلاۃ الحاجہ پڑھنے میں صرف ۲/ منٹ لگتے ہیں اور اپنے بچوں ہی کا نام نہیں بلکہ دس پندرہ پوتوں اور نواسوں کا نام لے کر بھی ہم اس طرح دعا کریں گے تو دو چار منٹ سے زائد کا وقت نہیں لگے، دن بھر 24 گھنٹے میں 1440 منٹ میں صرف 5 منٹ بھی رحیم وکریم آقا سے اپنی اولاد کے لیے التجاء ودعا کے لیے کیا ہم نکال نہیں سکتے؟ پھر ہم کیسے امید رکھیں کہ ہمارے بچے ہمارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور بن کر دنیا میں اسلام کا پرچم لہرائیں گے اور دعوت ودین کا کام کریں گے۔

آپ آس پاس ہی نظر دوڑائیے، یا ماضی قریب کی صرف ہمارے ملک کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے، ملت کے اکثر نامور فرزندان کے وا ین کا شمار صلحاء وعلماء میں نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ عام قسم کے انسان تھے لیکن اپنی اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں وہ ان مذکورہ بالا اصول پر کاربند تھے جن کا اہتمام مفکر اسلامؒ کی وا ہ کے یہاں تھا، اسی طرح کتنے صلحاء وعلماء کی اولاد میں ہم کو ایسے افراد نظر آئیں گے جن سے قوم وملت ہی نہیں خود ان کے وا ین تنگ آ کر پناہ مانگنے لگے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اچھے دیندار گھرانے سے ان کی نسبت کے زعم نے اپنی اولاد کی اخلاقی ودینی تربیت سے ان کے وا ین کو غافل کر دیا تھا جس کا وہ خمیازہ ناخلف اولاد کی صورت میں بھگتتے رہے۔

ہمیں یہ زعم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نیک، ہمارا گھرانہ نیک، ہمارا ماحول نیک، انبیاء کرام جیسے اولوالعزم بندگانِ خدا کو

بھی اپنی اولاد کی گمراہی کا ڈر لگا رہتا تھا اور وہ اس کے لیے برابر اللہ تعالی سے دست بدعا رہتے تھے، جب ان معصوم پیغمبران اکا یہ عالم تھا تو ہما شما کی کیا حیثیت ہے اور ہم کو کس قدر اپنے اور اپنی اولاد کے متعلق ڈرتے رہنا چاہیے۔

کسی کو عار دلانے یا کسی کی دل آزاری کرنے، کسی گناہ پر کسی کو طعنہ دینے، اس کا چرچہ کرنے اور لوگوں میں اس کی تشہیر کرنے کے گناہ میں ہم مبتلا ہوں گے تو ہماری یہ عادت اللہ تعالی کو اتنی ناپسند ہوگی کہ جیتے جی خود ہماری اولاد ہی میں ہمارے لیے برا انجام دکھائیں گے اور ہم خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوں گے، غلطی اور گناہ انسان ہی سے صادر ہوتے ہیں، بڑے سے بڑا گناہ بھی کسی سے سرزد ہو تو دوسروں کے سامنے اس کا ذکر کرنے، چرچہ کرنے اور اس کی تشہیر سے بچیں، ان سے براہ راست مل کر یا قریب بلا کر محبت سے سمجھانے کی کوشش کریں، کیا بعید کہ اللہ تعالی آپ کی ان مخلصانہ باتوں کو اس کے دل میں اتار دے اور وہ گناہوں سے تائب ہو جائے، یا پھر اس کے لیے اور ان کے وا ین کے لیے عذر تلاش کریں اور یہ سوچیں کہ کیا اس کی جگہ میری اولاد ہوتی یا میرے بھائیوں یا میرے کسی رشتہ دار کے بچے ہوتے تو کیا میرا اس وقت بھی ردعمل یہی ہوتا یا پھر میں کسی طرح کی تاویل کر کے ان کو بچانے یا ان کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا، دوسروں کی ستر پوشی اور عیوب پر پردہ ڈالنے کی عادت وصفت ستار العیوب و رب العالمین آقا کو اتنی پسند ہے کہ اس نے قیامت کے روز اپنے ایسے بندوں کی ستاری کا وعدہ فرمایا ہے۔

ہم اپنی اولاد ہی کی نیک نامی کے لیے حتی المقدور کوشش کریں اور ان کی اخلاقی و دینی تربیت میں کوئی کوتاہی نہ کریں، دینی تعلیم سے ان کو آراستہ کریں اور پھر اللہ تعالی سے روزانہ برابر اپنے بچوں کا نام لے کر دعا بھی کرتے رہیں، اس کے لیے قرآن مجید میں مؤثر ترین دعا بھی ہمیں سکھائی گئی اس کا روزانہ معمول بنائیں کہ اے اللہ:۔ میرے لیے ایسی بیوی اور بچے عنایت فرما کہ جو میرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں اور مجھے متقیوں کا امام بنا (رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَاماً)۔

غصہ کی حالت میں بھی اپنی اولاد کے لیے گالی گلوچ اور غیر شعوری طور پر بھی ایسے نازیبا کلمات سے اپنی زبان کو بچائیں جس کا شمار بددعائیہ کلمات میں ہوتا ہے پھر ان کے لیے اللہ تعالی سے التجائیں کریں اور ان کے لیے روزانہ دو رکعت صلاۃ الحاجۃ پڑھنے کا آج سے ہم معمول بنائیں، پھر قدرت الہی کا کرشمہ دیکھیں کہ بگڑا، بدنام، سرکش، بات نہ ماننے والا، ضد کرنے والا، نمازوں میں سستی کرنے والا، بری صحبت میں رہنے والا ہمارا جگر کا یہ ٹکڑا جو کل تک خون کے آنسو رلا رہا تھا فضل خداوندی سے انشاء اللہ خود بخود اس میں تبدیلی آئے گی اور وہ مطیع وفرمابردار بن کر ہمارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا۔

☆☆☆

احتساب

اتنے مانوس صیاد سے ہوگئے ہیں

محمد قمر الزماں ندوی

آج ہم مسلمانوں کے اندر کتنی بے حسی آگئی ہے، ہم کتنے بے وقعت اور بے وزن ہوگئے ہیں، اور کس قدر اپنے حقوق وفرائض سے غافل ہوگئے ہیں اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں۔

.....ایک دفعہ ایک بادشاہ نے دیکھا کہ ایک دریا پر پل بنانے کی ضرورت ہے۔ وہ روز یہ دیکھتا تھا کہ لوگ دریا میں گزرتے ہوئے بھیگ کر جاتے ہیں۔ اس نے اپنے مشیروں کو بلایا اور کہا ''میں یہ چاہتا ہوں کہ اس دریا پر پل بنایا جائے''۔ مشیروں نے کہا: ''جناب پل بنانے کے لئے پیسے نہیں ہیں'' بادشاہ نے کہا: ''ایسا کرو قرض لے کر پل بنا لیتے ہیں جب پل بن جائے تو اس پر ایک روپیہ ٹیکس لگا دیں گے جو بھی اس پل سے گزرے گا ایک روپیہ دیتا جائے اور اس طرح کچھ عرصے میں ہماری رقم پوری ہوجائے گی''۔ بادشاہ کا مشورہ مان لیا گیا اور پل کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ جب پل مکمل ہوگیا اور لوگوں کی آمد ورفت شروع ہوئی تو ہر شخص سے ایک روپیہ کا مطالبہ کیا جاتا اور وہ ایک روپیہ دیتے ہوئے گزر جاتا۔ کچھ عرصے بعد مشیر بادشاہ کے پاس آئے اور یہ گفتگو ہوئی::

بادشاہ: ہاں بھئی! سناؤ پل پر لوگ ایک روپیہ دیتے ہیں؟

مشیر: جی حضور لوگ دے رہے ہیں اور ہمارا خرچ پورا ہوگیا ہے، کیا ہم اب ایک روپیہ لینا چھوڑ دیں؟

بادشاہ: یوں کرو اب دو روپئے لیا کرو۔

مشیر یہ سن کر چلا جاتا ہے اور کچھ عرصے بعد آتا ہے۔

بادشاہ: اب سناؤ کیا حال ہے۔

مشیر: جناب ہمیں بہت فائدہ ہوگیا ہے اور بہت پیسے اکٹھے ہوگئے ہیں۔ اب پیسے لینا چھوڑ دیں؟

بادشاہ: کیا کسی نے شکایت کی ہے۔

مشیر: جی نہیں۔

بادشاہ: یوں کرو اب پانچ روپئے لیا کرو۔

کچھ عرصے بعد مشیر پھر آئے اور پھر وہی عرض کی۔

بادشاہ: کیا کسی نے شکایت کی ہے۔

مشیر: جی نہیں۔

بادشاہ: یوں کرو پل کی دوسری جانب ایک جلاد کو چھڑی دے کر کھڑا کر دو۔ جب بھی کوئی پانچ روپئے دیتا ہوا پل پار کر کے دوسری جانب جائے تو جلاد اس کی چھڑی سے مرمت کرے۔

مشیر حیران تو ہوئے لیکن پھر چل پڑے اور یہ حکم بجالائے۔

کچھ عرصے بعد مشیر جب دوبارہ آئے اور بادشاہ نے پوچھا کہ کوئی

شکایت تو نہیں آئی تو مشیر نے عرض کی۔

مشیر: جناب ایک شکایت آئی ہے۔

بادشاہ بھی خوش ہوا کہ شکر ہے کسی کو تو عقل ہے۔

بولا: ہاں بتاؤ کیا بات ہے۔

مشیر: جناب لوگ کہہ رہے ہیں کہ دوسری جانب آپ نے جہاں ایک جلاد کو کھڑا کیا ہے وہاں تین جلاد ہونے چاہئیں ایک جلاد کی وجہ سے لائن لمبی ہو جاتی ہے اور ہمارا کھڑے کھڑے کافی وقت ضائع ہو جاتا ہے''

یہ واقعہ سچا ہے یا محض ایک تمثیل ہے اور اس کہانی میں کتنی صداقت ہے اس سے ہمیں بحث نہیں، اس واقعہ کی روشنی میں ہم مسلمان اپنے حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں، اپنا محاسبہ کر سکتے ہیں، اپنے گریباں میں جھانک سکتے ہیں کہ ہم مسلمان اس وقت اس دنیا میں ایک قوم ہیں یا پھر ایک ہجوم، ہمارے ساتھ جو بھی ظلم وستم اور ناروا سلوک کیا جائے ہم برداشت کرتے جاتے ہیں، اپنے دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی کبھی ہمت نہیں کرتے، حق کو حق کہنے اور باطل کو باطل کہنے سے بھی گھبراتے ہیں، اگر کوئی ظلم وسفاکی کے خلاف، باطل اور طاغوتی حکومت ونظام کے خلاف لب کشائی کرتا ہے حق کا آوازہ بلند کرنا چاہتا ہے دن کو دن رات کو رات تاریکی کو تاریکی اور روشنی کو روشنی بتاتا ہے تو اسے بھی مصلحت اور حکمت کا تقاضہ بتا کر دانشورانِ قوم اور رہبران ملت خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلمان پوری دنیا میں سختیاں سہتے سہتے کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ سختیاں سہنا، ظلم برداشت کرنا، ذلت ورسوائی جھیلنا ان کی عادت سی ہو گئی ہے۔

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے ہیں
اب رہائی ملی تو جی نہ پائیں گے

اوپر بیان کی گئی کہانی یا تمثیل اور شاعر کے مذکورہ شعر کی روشنی میں ہم برملا یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کچھ حال ہے ہم مسلمانوں کا، اگر ہم مسلمانوں نے اصلاح حال کی کوشش نہیں کی، اپنے آپ کو نہیں بدلا اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کی اپنی صفوں سے نفاق اور منافقت کے بیج اور جراثیم کو ختم نہیں کیا، بزدلی اور وہم کو اپنے اندر سے نہیں نکالا اور خود اپنے آپ کو بدلنے کی فکر نہیں کی تو اللہ تعالیٰ بھی ہماری حالت کو نہیں بدلے گا کیوں کہ قرآنی ضابطہ اور خدائی قانون یہی ہے کہ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

لہذا ضرورت ہے کہ ہم مسلمان اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں اپنی صفوں میں اتحاد واتفاق کی تخم ریزی کریں، اور اپنے مقام اور حیثیت کو ، آستین کے سانپوں سے ہوشیار رہیں اور اپنی ہی صفوں میں پلنے والے میر صادق اور میر جعفر سے چوکنا رہیں، درہم ودینار اور ریال وڈالر کے پجاری جو عرب کے فتنۂ زرِ سیال سے اپنا پیٹ پالتے ہیں ان کو ان کی اوقات یاد دلا دیں۔

ہم اپنے اندر یہ احساس پیدا کریں کہ ہم ہی وہ قوم اور امت ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے برپا کیا ہے تا کہ ہم ظلم وستم کے خلاف سد سکندری بن کر لوگوں کو لوگوں کی عبادت سے نکال کر خدائے واحد کی عبادت کی طرف لائیں اور ادیان ومذاہب کے ظلم وستم سے نکال کر اسلام کے عادلانہ نظام کی طرف لائیں اگر ہم نے وقت اور حالات کے تقاضے کو نہیں سمجھا اور ہوا کے رخ کو نہیں بھانپا تو کل اس سے بھی بداور بدتر حالات کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیں۔

ورنہ کل گلشن تو کیا دریا تلک جل جائے گا
جنگلوں کی آگ سے صحرا تلک جل جائے گا

☆☆☆

تبصرہ

ماہنامہ الفرقان خصوصی اشاعت

(ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء)

بعنوان: (ملک کا نیا منظر نامہ اور مسلمانان ہند کی حکمت عملی)

صفحات: ۲۱۶

بقلم: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کے تابناک ماضی، کامیاب اسلامی صحافت اور اس کے عظیم بانی کی بے لوث خدماتِ دین سے کس صاحب نظر کو واقفیت نہیں، اس علمی و دینی اور دعوتی مجلّہ نے ملت ہندیہ کی ۸۲ بہاریں دیکھی ہیں، بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے، کئی مرتبہ مہلک سیلابوں سے ڈوب کر نکلا ہے اور کشتیٔ ملت کو ساحل سے ہمکنار کیا ہے، اس کے دامن میں ملتِ اسلامیہ کی تاریخ محفوظ ہے، انقلابات کے رموز و اسرار کا یہ راز دار ہے، باطل فرقوں کی تردید، بدعات کی بیخ کنی، شیعیت وخمینیت کی جڑیں کاٹنے میں اس نے کردار ادا کیا ہے، بسا اوقات نظریاتی اختلافات میں اس نے ملت کی صحیح رہنمائی کی ہے، اس کی یہ خاص اشاعت بھی بر وقت ہے، راقم کے پاس جب الفرقان کا یہ خصوصی شمارہ پہنچا تو سرورق اس کے عنوان کو دیکھ کر فورا ورق گردانی شروع کردی، اس خصوصی اشاعت میں ایک طرف ماضی قریب کے کچھ اہم مفکرین و مخلصین اہل قلم کی خون جگر سے لکھی گئی تحریریں ہیں جو دل کے داغ دکھاتی اور خون کے آنسو رلاتی ہیں تو دوسری طرف بعض دیگر معزز و معاصر شخصیات کے افکار و تجربات کی جولانیاں ہیں جو موجودہ منظر نامہ کی عکاس اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل ہیں۔

راقم کو یہ عرض کرنے کی اجازت دی جائے کہ مسئلہ ملک کے نئے منظر نامے سے واقفیت کا ہے نہ حکمت عملی کے طے ہونے کا، حکمت عملی بھی تقریبا سب کے ذہنوں میں ہے اور منظر نامہ سے بھی خواص و دانشور سب واقف ہیں بلکہ اپنے اپنے احساس کے بقدر مضطرب بھی ہیں، دراصل کسی مسئلہ سے اگر آج پوری امت بالخصوص ملت اسلامیہ ہندیہ پریشان ہے تو وہ حکمت علمی پر عمل درآمد نہ ہونے سے پریشان ہے، نظریات کی بھیڑ ہے، کانفرنسز کی بھرمار ہے، مضامین و مقالات شاید اس تعداد میں کبھی اور لکھے گئے ہوں، لیکن نہ مادیت سے نجات ہے نہ مادی زندگی سے، اجتماعی اخلاقیات کے فساد نے ہر شخص کو دوسرے سے الگ کر رکھا ہے، ایک عجیب سا حجاب ہے جو لوگوں کو کسی ایک حکمت عملی پر متفق نہیں ہونے دیتا، ضرورت کے نام پر مادیت کی سب سے مکروہ صورت وہاں نظر آتی ہے جہاں سب سے زیادہ اس سے نفرت دلائی جاتی ہے، پھر اس کے نتیجہ میں مفادات کے حصول کی خواہش جنم لیتی ہے اور نتیجۃً اس کی زد اجتماعی اخلاق اور ملت کی اجتماعی حالت پر پڑتی ہے، نظریات اور مفادات کے سمندر میں صحیح اور مخلص قیادت کا ایسا فقدان شاید تاریخ کے کسی دور میں نہ ہوا ہو، اس صورت حال میں اشد ضرورت اخلاص و عمل کی ہے، جس کی طرف توجہ دلانے کے لیے الفرقان کا یہ قیمتی شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ (بقیہ ص نمبر ۷ پر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

Date.....
Ref.....

التاریخ.....
الرقم .....

اعلان مسابقہ بین المدارس

محترم ومکرم ناظم/مہتمم صاحب دامت برکاتہم (مدرسہ.....)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے۔

''علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن'' آپ کی دعاؤں کے نتیجہ میں علمی، فکری اور تعلیمی وسماجی میدانوں میں کسی نہ کسی حالت میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے، جس کی اطلاعات جناب والا کو پہنچتی رہتی ہوں گی۔

فاؤنڈیشن کے زیر انتظام ادارہ ''مدرسۃ العلوم الاسلامیہ'' میں سالانہ انعامی مقابلے صرف مدرسہ کے طلبہ میں نہیں کرائے جاتے بلکہ ضلعی سطح پر بین المدارس اور عصری اسکولوں کو شامل کر کے یہ مقابلے ہوتے ہیں۔

اس مرتبہ انتظامیہ نے یہ طے کیا ہے کہ یہ مقابلے صوبائی سطح پر منعقد ہوں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ملحق اتر پردیش کے ان اداروں کو اس میں شامل کیا جائے جہاں کم از کم عالیہ اولیٰ تک تعلیم ہوتی ہے، اسی طرح فاؤنڈیشن علی گڑھ کے اسکولوں کے درمیان بھی امسال سائنس ودینیات کمپیٹیشن منعقد کر رہا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ طلبہ کی فکری وثقافتی تربیت اور ان کے مسابقاتی ذہن کو تشکیل دینے والے اس پروگرام میں ہمارا علمی، فکری اور بہر اعتبار بہتر سے بہتر تعاون فرمائیں گے، اور اپنے طلبہ کو اس مقابلہ میں شرکت کے لیے اپنی ذمہ داری سمجھ کر ضرور بالضرور بھیجیں گے، یہی ہمارا سب سے بڑا تعاون ہے۔

عناوین اور شرائط کے صفحات منسلک ہیں۔

جزاکم اللہ احسن الجزاء

والسلام
محمد طارق ندوی رامپوری
صدر: جمعیۃ الاصلاح
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

رابطہ اور معلومات کے لئے:
allupcompetition@gmail.com
www.nadwifoundation.org
محمد طارق ندوی رامپوری 07417763557
محمد فرید حبیب ندوی 08273129816

Hamdard Nagar-D, Quarsi By Pass Aligarh, U.P. 202002
E-mail. mdtariqnadwialig@yahoo.co.in, Web: nadwifoundation.org
Principal Office: +91 0571 6050555, Cell:+91 09045794046

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Madrasatul Uloom Al- Islamia — **مدرسة العلوم الاسلامیه**

Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India — ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

Date.............. التاریخ.........

Ref................ الرقم ....

پروگرام کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ یہ مقابلے ۵/تا ۷/مارچ ہوں گے، افتتاحی پروگرام ۵/مارچ جمعہ کی شام کو ہوگا۔

۲۔ یہ مقابلے اردو مقالہ نگاری، عربی، اردو اور انگریزی تقریر، عربی بیت بازی، اردو بیت بازی اور نحو وصرف کوئز پر مشتمل ہوں گے۔

۳۔ اردو، عربی، انگریزی تقریر اور اردو مقالہ نگاری میں علیا وسفلی دو گروپ ہوں گے، بقیہ مقابلوں میں علیا وسفلی کی کوئی تفریق نہیں ہوگی۔ صرف انگریزی تقریر کے دونوں گروپ میں مدارس کے ساتھ علی گڑھ کے اسکولوں کے طلبہ کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔

۴۔ سفلی گروپ ثانویہ ثالثہ تا ثانویہ سادسہ اور علیا گروپ عالیہ اولی تا عالیہ ثالثہ پر مشتمل ہوگا۔

۵۔ بیت بازی میں ہر مدرسہ کی دو طلبہ پر مشتمل ٹیم ہوگی، عربی بیت بازی تو روایتی انداز میں ہوگی، لیکن اردو بیت بازی روایتی انداز سے ہٹ کر ہوگی، جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے راؤنڈ میں تمام ٹیموں کو آخری حرف سے، دوسرے راؤنڈ میں صدر جلسہ اساطین ومشاہیر شعراء میں سے کسی کا نام لیں گے جس کے کلام سے شعر پڑھنا ہوگا، اور تیسرے راؤنڈ میں صدر محترم کوئی لفظ دیں گے جیسے رب، دل، جگر وغیرہ، طالب علم کو ایسا شعر پڑھنا ہوگا جس میں وہ لفظ مستعمل ہو۔

۶۔ نحو وصرف کا مقابلہ فیض النحو اور کتاب الصرف پر مشتمل ہوگا۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ پہلے مرحلہ میں ۵۰/سوال Objective انداز کے دیئے جائیں گے، اس طور پر کہ ایک سوال کے چار جواب لکھے ہوں گے، ان میں سے صحیح جواب پر ٹِک لگانا ہوگا، مثال کے طور پر:

فاعل کا اعراب کیا ہوتا ہے؟

(۱) مرفوع (۲) منصوب (۳) مجرور (۴) تینوں میں سے کوئی نہیں

پھر اس میں کامیاب ہونے والے طلبہ کے درمیان کوئز کا مقابلہ ہوگا، اس طور پر کہ پہلے سے نحو وصرف کے مسائل پر مشتمل سوالات کی پرچیوں میں سے صدر محترم کوئی پرچی اٹھا کر بچہ سے سوال پوچھیں گے۔

۷۔ آنے والے طلبہ کو قیام وطعام کی سہولت دی جائے گی، اسٹیشن سے انہیں ریسیو کیا جائے گا، ہر مسابقہ اور ہر گروپ میں اول، دوم سوم اور تشجیعی انعامات دئے جائیں گے، ہر انعام کتابوں، نقد رقم، سند اور شیلڈ پر مشتمل ہوگا۔

۸۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس مدرسہ کے طلبہ تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ انعامات حاصل کریں گے اس مدرسہ کو ایک بڑی ''سید سلیمان ندوی ٹرافی'' دی جائے گی، اسی طرح دوسری پوزیشن حاصل کرنے والے مدرسہ کو ''ابوالحسن علی ندوی ٹرافی'' دی جائے گی۔

☆☆☆

Hamdard Nagar-D, Quarsi By Pass Aligarh, U.P. 202002
E-mail. mdtariqnadwialig@yahoo.co.in, Web: nadwifoundation.org
Principal Office: +91 0571 6050555, Cell:+91 09045794046

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India

مدرسة العلوم الاسلامیه
ہمدردنگرڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

Date.............
Ref...............

التاریخ.........
الرقم ....

شــــــــرائط

ا۔ ۲۰/فروری تک شرکت کی اطلاع بذریعہ ای میل یا فون دینا لازمی ہے۔

۲۔ ۲۸/فروری تک وقت آمد اور ٹرین کے نام وغیرہ سے ضرور مطلع کریں۔

۳۔ ۵/مارچ کی شام تک ضرور تشریف لے آئیں، افتتاحی پروگرام انشاء اللہ ۵/مارچ کی شام کو ہی ہوگا۔

۴۔ ہر مقابلے کے دونوں گروپ میں ایک مدرسہ کے صرف دو-دو طلبہ شریک ہوسکیں گے۔

۵۔ شرکت کے لئے لازمی ہے کہ ہمارے ذریعہ ارسال کئے گئے فارم پر دفتر اہتمام کی مہر کے ساتھ بذریعہ ای میل یا ڈاک اطلاع دی جائے۔

۶۔ طبقہ علیا کو تقریر کے لئے زیادہ سے زیادہ ۸/منٹ دئے جائیں گے، اور سفلی کو ۶/منٹ۔

۷۔ مقالہ A-4 سائز کے کم از کم دس صفحات پر مشتمل ہو، ۲۸/فروری تک مقالہ بذریعہ ای میل یا ڈاک موصول ہونا لازمی ہے، پیشگی آنے پر اس کا چیک کرنا ممتحن حضرات کے لئے آسان ہوگا۔

۸۔ ۱۰۰/نمبر مقالہ خوانی اور ۱۰۰/نمبر مقالہ نگاری کے ہوں گے۔

۹۔ مقالہ خوانی کے لئے تلخیص ساتھ لائیں جو ۷/منٹ میں پیش کی جاسکے۔

۱۰۔ طلبہ کی آمد و رفت کا خرچ خود ان پر یا ان کے مدرسہ پر ہوگا۔

عناوین:

(۱) **اردو مقالہ نگاری**

علیا: ندوۃ العلماء کا علمی ودعوتی منہج

سفلی: تحریک ندوۃ العلماء کی تاریخ وخدمات-ایک جائزہ

(۲) **اردو تقریر**

علیا: اسلام اور امن عالم

سفلی: اسلام کا پیغام انسانیت کے نام

(۳) **عربی تقریر**

علیا: كيف نقاوم الإلحاد الفكري الجديد

سفلی: مسؤلية الشباب المسلم

(٤) **انگریزی تقریر**

علیا: **Islam and Peace**

سفلی: **Moral Values in the Life of Prophet Mohammad (SAW)**

(۵) **بیت بازی:**

☆اردو ☆عربی

☆☆☆

Hamdard Nagar-D, Quarsi By Pass Aligarh, U.P. 202002
E-mail. mdtariqnadwialig@yahoo.co.in, Web: nadwifoundation.org
Principal Office: +91 0571 6050555, Cell:+91 09045794046

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India

مدرسة العلوم الاسلامیه
ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

Date.............. التاریخ.........
Ref................ الرقم ....

Dear principal/Director/Head of ....

May the mercy and blessing of Allah be upon you.

As you know very well that **Allama Abul Hasan Ali Nadwi educational and welfare foundation, Aligarh**, as an active educational movement, has been running with its excellent services in various educational fields for the last few years. At the district level, the foundation has held different types of cultural and presentable contests aimed purely to promote the students' ideological, mental and educational abilities.

This year the Foundation, has a plan for organizing **"Science and Islamic Studies Quiz"** and **"English Speech Competition"** among the students of all schools in Aligarh. We hope you ensure participation of your students in competition with full preparation.

Please see the details enclosed. Winners will be awarded with a prize, which will consist of cash, books, shield and certificate of merit.

Dr.M. Tariq Ayubi Nadwi
Principal
Madrasatul Uloom Al Islamia

For More Information Cont:
Mr. Mohammad Adnan Kazmi
Mob: 9359570727
Email: allupcompetition@gmail.com
Web: nadwifoundation.org

Hamdard Nagar-D, Quarsi By Pass Aligarh, U.P. 202002
E-mail. mdtariqnadwialig@yahoo.co.in, Web: nadwifoundation.org
Principal Office: +91 0571 6050555, Cell:+91 09045794046

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

Date.....
Ref.....

التاریخ.....
الرقم .....

1) The Competition will be divided into 2 groups.

(Group A Class 3rd to 5th, Group B Class 6th to 8th)

2) The Quiz Competition will be comprised of 100 objective questions, 80 questions of Science and 20 of Islamic Studies. Answers will be checked with Negative marking (0.25 mark on each incorrect answer)

3) The Questions will be from the current Syllabus of the Schools.

4) The Science, Islamic Studies Quiz Competition will be held on 1st February at 10:00 am. to 11:30, and English Speech Competition will be on 5th March during All U.P. Madrasa Competition of Urdu, Arabic, and English Speeches. Madarsa Students also will take part in English Speech Competition.

5) The Result of Science-Islamic Studies Quiz will be declared on 10th February. It may be seen on our Website. The Concerned School also will be informed.

6) The Prizes will be distributed on 7th March in the Presence of Maulana Rabey Nadwi (Prisedent of All India Muslim Personal Law Board) and AMU Voice Chancellor and Many other Great Personalities.

7) Each Prize will consist of Cash, Books, Shield and Merit Certificate.

8) Quiz will have 3 main Prizes along with 5 Consolation Prizes while English Speech Competition will have 3 main Prize along with 1 Consolation Prize.

9) The Last Date of Registration is 22nd January the Hall Ticket at the end of this Page should be Photocopied. Each Participant should Fill it and Send it by Email or submit it in the Office of Madrasatul Uloom Al Islamia for each contest with the seal.sign of Principal of the Concerned School.

10) The Hall Ticket will be sent to the Principal of the concerned school till 28th Feb or it can be collected from the Office of Madrasatul uloom al islamia.

11) The School - whose Participants will win more awards than other School's Students – will be awarded with **IBNUL HAITHAM TROPHY**.

Hamdard Nagar-D, Quarsi By Pass Aligarh, U.P. 202002
E-mail. mdtariqnadwialig@yahoo.co.in, Web: nadwifoundation.org
Principal Office: +91 0571 6050555, Cell:+91 09045794046

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Madrasatul Uloom Al- Islamia
Hamdard Nagar D Jamalpur Aligarh U.P. India

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
ہمدرد نگر ڈی کوارسی بائی پاس روڈ جمال پور علی گڑھ

Date.....
Ref.....

التاریخ.....
الرقم .....

فارم برائے شرکت

نام طالب علم.....نام مدرسہ.....

درجہ.....گروپ.....

کس مسابقہ میں شرکت مطلوب ہے.....

پتہ.....

رابطہ نمبر.....

دستخط و مہر دفتر اہتمام

.....

نوٹ: اس کو ضرورت کے اعتبار سے فوٹو کاپی کرالیں یا ہماری ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کرلیں۔

Hall Ticket

Attested Recent Photo

Roll No. (For Office Use)_____
Student's name:_____
Father's name:_____
Class:_____
School :_____(Gender)_____
Contest's name:_____
Student's contact number:_____
School's contact Number_____
Date and Time (For office use) _____Test Center(For office use)_____
Seal and Sign of Concerned School _____

Hamdard Nagar-D, Quarsi By Pass Aligarh, U.P. 202002
E-mail. mdtariqnadwialig@yahoo.co.in, Web: nadwifoundation.org
Principal Office: +91 0571 6050555, Cell:+91 09045794046

آخری صفحہ

میری یہ آواز ہر دینی ادارے تک پہنچادی جائے

(م،ق،ن)

مولانا محمد تقی امینیؒ (۵رمئی ۱۹۲۶-۲۱رجنوری ۱۹۹۱) سابق ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کا شمار ہندوستان کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے، اکابر علماء نے انہیں عالمی فقیہ اور مثالی مربی کے لقب سے ملقب کیا۔ وہ معیاری اور شگفتہ قلم کے مالک تھے، قدیم وجدید علوم پر ان کی گہری نظر تھی فقہ اسلامی اور فکر جدید ان کا خاص اور محبوب موضوع تھا، متعدد علمی وتحقیقی کتابوں کے مؤلف ومصنف تھے۔ پندرہ روزہ ''احتساب'' کے مدیر بھی رہے ہیں۔ خطاء ونسیان انسان کی فطرت اور خمیر میں داخل ہے مولانا بھی انسان تھے فرشتہ نہیں، اس لئے مولانا مرحوم کے بعض اجتہادات، تفردات اور مسلکی توسع میں بہت حد تک اختلاف کی گنجائش ہے لیکن قدرت کی طرف سے مولانا کو جو دھڑکتا دل اور حساس قلب ونگاہ، دلسوزی اور غم گساری ودیعت کی گئی تھی یہ اوصاف ہیں جو آج کے طبقۂ علماء میں کم نظر آتے ہیں۔

شعبان (۱۴۰۲ھ) کے موقع پر مشہور دینی درس گاہ ''معہدِ ملت مالیگاؤں'' میں ختم بخاری کی تقریب منعقد کی گئی تھی جس کی صدارت مولانا امینیؒ نے فرمائی تھی، مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں دینی درس گاہوں اور ملی اداروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی تھی اور پر جوش انداز میں فرمایا تھا۔ ''میری یہ آواز ہر دینی ادارے تک پہنچادی جائے''

واقعہ یہ ہے کہ حالات کی سنگینی، مدارس اسلامیہ اور دینی اداروں میں داخلی اور خارجی انتشار، اساتذہ کی بے اطمینانی اور ان کے اندر احساس کمتری وکہتری اور اس کے خطرناک نتائج کے پیش نظر ضرورت ہے کہ یہ آواز ہر دینی ادارے اور عوام تک پہنچائی جائے، تاکہ وہاں کے ارباب انتظام اور ذمہ داران ہوش کے ناخن لیں اور آج کے بدلے ہوئے حالات میں نیا لائحہ عمل مرتب کر کے اس کو نافذ کریں۔

مولانا کے دردمندانہ خطاب کا یہ حصہ ملاحظہ کیجئے!

''آج عرب کا زرسیال فتنہ بن کر ہمارے سامنے آرہا ہے، اس فتنہ کی زد میں مدارس بھی آگئے ہیں، حالات بدل گئے ہیں، اور زمانہ کی بہت سی ضرورتیں تبدیل ہوگئی ہیں، اور علماء کے لئے روزی روٹی کا مسئلہ پیچیدہ بن گیا ہے اس لئے باصلاحیت اور ذی استعداد کہاں سے کہاں جارہے ہیں، ان کا میدان عمل کیا ہونا چاہئے تھا اور کیا منتخب کررہے ہیں، آخر فکر معاش میں جب تک ان کو فراغت نہ ہوگی وہ کیسے ریسرچ کریں گے کس طرح تدریس، تصنیف وتالیف، افتاء وتبلیغ اور امامت وخطابت کے فریضے کو انجام دیں گے؟ اس لئے ان کی ضرورتوں کا تو خیال رکھنا ہی چاہیے حضورﷺ کا ارشاد ہے: کاد الفقر أن یکون کفرا۔ یعنی فقر اور محتاجی بسا اوقات انسان کو کفر تک پہنچادیتی ہے اس لئے میری یہ آواز ندوۃ العلماء لکھنؤ، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ، دارالعلوم دیوبند اور تمام دینی درسگاہوں، ملی اداروں اور مساجد کے ذمہ داروں تک پہنچادی جائے کہ علماء اور دینی خدمت گزاروں کا خود کفیل بنایا جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہیں مالدار بنادو مگر ایک متوسط زندگی کی کفالت کا انتظام تو ہونا چاہیے، ان کی ہوس کی تکمیل مت کرو مگر ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا سامان تو ضرور کرو۔ اگر تم ان کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت جیسی نہ سمجھو گے اور انہیں خود کفیل نہ بناؤ گے تو وہ کسی دوسری جگہ سے اپنی ضرورت کی تکمیل کریں گے اور آہستہ آہستہ دینی رجحان کم ہوتا چلا جائے گا اور اس طرح اچھے اور ذہین افراد کی آمد کم ہوجائے گی جس کے نتیجہ میں علمی تحقیقی اور دینی معیار پست سے پست تر ہوتا چلا جائے گا، جس کی ذمہ داری موجودہ ذمہ داروں پر عائد ہوگی۔ آج مدارس دینیہ داؤں پر لگ رہے ہیں، زرِسیال کا سیلاب جوموج کی طرح آرہا ہے اس سے بڑے خطرات پیدا ہورہے ہیں۔ لہٰذا پانی سر سے اونچا ہونے سے قبل ہی اس سیلاب کا ضرور تدارک کرنا ہوگا۔ ورنہ اچھے اور باصلاحیت علماء اور دینی خدمت گذاروں کا قحط پڑجائے گا''۔

(چراغ راہ از مولانا رضوان القاسمی)

☆☆☆